برجِ خموشاں
افسانے
اسد محمد خاں

افسانے

برجِ خموشاں

اسد محمد خاں

فرزانہ اسد کے نام

ناشر ○ سیفورڈ مین۔ سی ۱۴۱ شہر بانو پلازا ایف بی ایریا کراچی

سرورق ○ انعام راجا

تزئین ○ اظہر عباس جعفری

مطبع ○ ابنِ حسن پریس

قیمت ○ ۵۰ روپے
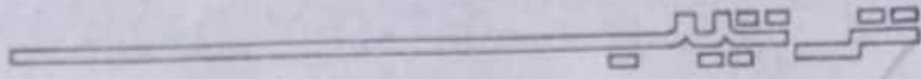
ترتیب

مناجات

یا دافع الاشرار !
ہمیں کافروں کے شر سے محفوظ رکھ
کسی بھی مشرک، ملحد، زندیق، غیر مُقلّد، غیر کفو کے رو بہ رو خجل نہ ہونے دے
ہمیں سرخروئی عطا فرما۔
مولا ! اب تو کچھ ایسا ہو کہ ایک فزی سسٹ ہماری ہی صفوں سے اُٹھے
جو کھڑے ہو کر سلام پڑھتا ہو۔
کہ جیبوں میں ڈھیلے لے کر چلتا ہو۔
جو اسٹاکھوم کے چورستوں میں قینچیاں مارے
کہ مشرکینِ بیرونی اور کُفّار مقامی کا پِتّا پانی ہووے۔

بارِ الٰہا !
کچھ ایسا ہو کہ فلاں فلاں ملک کی مثال ہم پٹرول سے اور بے شمار معدنیات
سے مونہا مُنھ بھر جائیں
تاکہ ہم روزناموں کی شہ سرخیوں میں
تاکہ ٹیلی وژن کی اسکرینوں پر
تاکہ یونی ورسٹیوں میں
تاکہ چورستوں، ہوائی اڈّوں پر
تاکہ ڈاک کے ٹکٹوں پر

ہم آرام سے تیرے نام کا جھنڈا اڑا سکیں
اور ملحدوں کافروں مشرکوں کی بستیوں کی جانب مُنھ پر کلائیاں رکھ کر
آرام سے بکرا بُلا سکیں۔

یا نافع الانعام!
ہمارے بکرے جوع البقر سے
ہماری گائیں گھوڑوں سے
ہمارے گھوڑے اصطبلوں سے
ہمارے اصطبل کتابوں سے معمور رہیں
اور اِس معمورے میں ہماری بڑھکوں کے سوا کان پڑی آواز نہ سنائی
دے، آمین۔
(اور اگر یہ سب مناسب نہ ہو تو)
اے صاحب الکلام!
وہ ترے نام کا زرِ مُبادلہ بلند کرنے اپنے گھروں سے نکلے ہیں۔
اپنی نصرت بھیج
ہمارے قوّالوں کے حلق کشادہ کر
ہمارے ڈوم ڈھاڑیوں کو زمین پر پھیل جانے کا اِذن دے۔

یا صاحب الجنود! یا فاتحِ الھنودُ و الیھُود!
ہمارے کھلاڑیوں ہی کو ہر نوع کی سربلندی عطا کر
کہ اب تو وہی ہمارا اثاث البیت ہیں

اور اے مالک الجندل!
ہمارے دشمنوں کو آپ اندر سے سنگسار فرما
اُن کی میانیوں میں برف باری کر، دھماکے فرما

اور ہاں اے مالک الملک!
ہو نہ ہو یہ شخص ام رخ دل آزار آدمی ہے
کہ برابر لکھ لکھ کے دل آزاری کا اِرتکاب کیے جاتا ہے
پس اے لایزال، اے لامکان، اے لازمان
الاَمان! الاَمان! الاَمان!

گھس بیٹھیا

ببر یار خاں نے کاسٹ آئرن اور لکڑی سے بنی ہوئی مضبوط بنچ کے نیچے پڑے پڑے آسودگی سے ٹانگیں پھیلائیں اور جان دے دی۔

آخری خیال جو گردن کا منکا ڈھلنے سے پہلے اُن کے دماغ میں آیا ڈیچن لکھیرے کے بارے میں تھا۔ ڈیچن لکھیرا اسی بنچ کے اُوپر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت کتنی ہزار آدمی ایڑیاں رگڑتے ہوتے دم توڑ رہے تھے۔ ببر یار خاں نے سوچا موت اچانک واقع ہو رہی ہے شہر کے مسلمان تو سارے ہی شہادت کے مرتبے پر فائز ہوں گے اور انشا اللہ جنّت الفردوس میں جگہ پائیں گے۔ پس طمانیت کے ساتھ ببر یار خاں نے کلمۂ شہادت پڑھنے کی کوشش کی اور ہمیشہ کی طرح اٹک گئے۔

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اُنھیں کلمۂ شہادت صحیح طور پر یاد بھی تھا یا نہیں۔ وہ اب تک اٹکل سے ہی کام چلاتے آتے تھے کیونکہ اُنھوں نے اپنے وقت میں بہت سی میتوں کو کاندھے دیے تھے اور وہ جانتے تھے کہ کاندھا دیتے ہوتے اخلاقاً کلمۂ شہادت پڑھنا پڑتا ہے۔ جو ذرا سے فرق کے ساتھ پہلے کلمے ہی کی طرح ہے۔ پہلا کلمہ اُنھیں ٹھیک ٹھیک یاد تھا۔ مگر اب جبکہ خود اپنی موت پر شہادت کا کلمہ پڑھنا تھا تو ضروری تھا کہ بالکل درست پڑھا جائے۔ ''یہ لیت و لعل کا وقت نہیں ہے۔'' اُنھوں نے سوچا ''مغفرت کا معاملہ ہے'' اُسی

وقت پنج کے اُوپر سے خرخرانے کی آواز آئی۔ وہی سالا ڈیبچن خرخرا رہا ہوگا۔ سُسرا مرُ ہی نہیں چکتا۔ اِن مُشرکوں کا معاملہ واقعی سخت ہے۔ توبہ استغفار! استغفر اللہ میرے معبود! آدمی گناہ بے تنک کر لے۔ مگر یہ شرک اور یہ کفر۔ توبہ توبہ!"

ایک وہ تھا مشرک۔ بھٹناگر ماسٹر۔ سڑے ہوتے دانتوں والا کافر۔ سُسرا ہر وقت مزے کرنے کا مشورہ دیا کرتا تھا۔ "ابے تُو پڑھ لکھ کر کیا کرے گا جاگیردار! مزے کر مزے۔ مزے کر مزے۔ مزے کر مزے حرامی پلّے!"

اب جبکہ زندگی کا معاملہ ہی ختم ہو رہا تھا تو چیزیں اور واقعات وضاحت کے ساتھ اور ایک ترتیب کے ساتھ ببر یار خاں کے ذہن میں آ رہے تھے۔ لیکن زمانی ترتیب اتنی باضابطہ بھی نہیں تھی۔ کچھ کچھ گڑبڑ ہو رہی تھی۔ کہیں کہیں تو پوری کی پوری دہائیاں غائب تھیں۔ مثلاً انھیں یہ یاد تھا کہ ملگجا پیجامہ اور مُشجّر کی شیروانی پہنے، سُرخ چمرودھے جوتوں میں ترچھے ترچھے قدم رکھتا ہوا جو ملگجا سا آدمی ولیمہ کھانے کے لیے دالان میں گھُس رہا تھا ببر یار خاں اُسے 'میاں' کہتے تھے۔ وہی اُن کا باپ تھا۔ اُس کے بعد گڑبڑ ہو گئی تھی۔ میاں کے سُرخ چمرودھے جوتے کتم عدم میں لٹک گئے تھے۔ بس مُشجّر کی لیر لیر شیروانی رہ گئی تھی جس کو اُدھیڑ کر اور کالی بٹی سے دھو کر کسی نے کتابیں رکھنے والا تھیلا بنا دیا تھا اور تھیلے پر بار بار لپلپاتا ہوا پتلا سا بید مارا جا رہا تھا۔ جو پٹاخا چھوٹنے کی سی آواز پیدا کرتا تھا۔ "ابے تو پڑھ لکھ کے کیا کرے گا جاگیردار! مزے کر مزے۔ مزے کر مزے۔ مزے کر مزے حرامی پلّے!"

چنانچہ ببر یار خاں نے بہت مزے لوٹے۔ یعنی یہی کہ چوتھی جماعت سے آگے ایک حرف پڑھ کے نہ دیا۔ خوب سیریں کیں، شکار کھیلے مقدور بھر فاقے اور حرامکاریاں کیں، آتشک لگالی اور وراثت سے محروم کر دیے گئے۔ مگر

یہ سب باتیں اس ترتیب میں نہیں ہوئی تھیں۔ پہلے انھیں وراثت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ کہا یہ گیا تھا کہ اُن کا باپ کیوں کہ اُن کے دادا کی زندگی میں فوت ہو گیا تھا چنانچہ اہلِ اسلام کے قانونِ وراثت اور شرع شریف کے مطابق خاندانی ترکے میں اُن کا کوئی حق نہیں بنتا۔ دیگر یہ کہ ببر یار خاں بے شک ظفر یار خاں کے نطفے سے ہو گا۔ (اس لیے کہ دونوں میں حد درجے کی مُشابہت موجود تھی) مگر اس بات کا ثبوت تو کہیں نہیں ہے کہ جو عورت ببر یار خاں کی ماں بتلائی جاتی ہے ظفر یار خاں کا اُس عورت سے نکاح بھی ہوا تھا؟ دیگر یہ کہ میاں وہ اشراف میں سے کب تھی۔ ظفر یار خاں کے تصرّف میں آنے سے پہلے جُمّرت نام تھا اس کا۔ بھیّا ماماؤں اصیلوں کو چاہے فُرّخ زمانی بیگم کہلواؤ، چاہے سنجھلی بہو کا لقب دے دو رہیں گی وہ جُمّرت کی جُمّرت ہی۔ اور اگر بھتی نکاح ہوا تھا تیری ماں کا تو نکاح نامہ اور گواہ شُد اور قضیات کا رِکاٹ کہیں سے نکلوا کر دکھا۔ منھ سُکیڑے کیا بیٹھا ہے؟ سمجھا بھتی؟۔ اَب تو جا مزے کر مزے۔ سمجھا؟ کہیں اور مزے کر سالے حرامی پلّے! گھُس بیٹھیے! ہمارا نسب نامہ خراب کرنے یہاں کیوں آمرا ہے۔

ببر یار خاں کو گھُس بیٹھیا، حرامی پلّا بنانے میں کِن کِن چیزوں کا ہاتھ تھا یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ سرسری طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ببر یار خاں نو عمر تھا اور اُس کے چچوں تایوں کی اولادیں سِنِ بلوغ کو پہنچی ہوئی مضبوط ناتھیالوں والی جمی جمائی اولادیں تھیں۔ بعض اولادیں تو ادھیڑ عمر کی تھیں، وہ سرج کی شیروانی پہنے رہتی تھیں اور راجے کو جھُک جھُک کر سلام کرتی تھیں۔ دیگر یہ کہ ظفر یار خاں مرحوم کے دوسرے عزیز و اقارب اور آس پاس کے معتبر لوگ خوفزدہ ہیجڑے تھے وہ اپنی اپنی ماؤں کے نکاح نامے موم جامے میں باندھے ہوئے اور اپنے اپنے ترکے پر اپنے پینڈے رکھے ہوئے جمے بیٹھے تھے اور روٹیاں چکنی کر کر کے کھا رہے تھے۔

انھیں خواہ مخواہ کسی گھس بیٹھیے کی حمایت کرنے کا اور جمے جمائے مضبوط لوگوں کو اللہ واسطے ناراض کرنے کا شوق نہیں تھا۔ "ارے بھیا تم ہی بتاؤ۔ دس بارہ برس کے محروم الارث لونڈے کے لیے ہاتھیوں سے دشمنی مول لینے کو کیا کسی حکیم نے بتایا ہے؟ یہ انگریز کی عملداری تو ہے نہیں میاں۔ رجواڑا ہے رجواڑا۔ لاشیں راتوں رات حلالی ندی میں بہائی بھی جا سکتی ہیں اور قیمہ وغیرہ کروا کے کتوں وغیرہ کو کھلائی بھی جا سکتی ہیں۔ ہمیں ابھی زندہ رہنا ہے۔ سمجھے مُنّیا؟"

دس بارہ برس کے ببر یار خاں کی بساط ہی کیا تھی چنانچہ اُس کی پوری ایک دہائی یہ سُن کر معدوم ہو گئی کہ اپنی ماں کے نکاح کا ثبوت لا کر دکھاؤ ولد الحرام! پھر یہاں رہنے کی سوچنا۔ پتا نہیں کس کے ساتھ اُس نے شہر چھوڑ دیا اور قریب کے کسی گاؤں میں رہ پڑا۔ گاؤں میں اُجاڑ سا ایک فارم تھا کسی رحمت اللہ ٹھیکے دار کا وہ شہر سے گاؤں آیا تو اُس نے ببر یار خاں کو جنگلی پھل کھاتے اور لکڑیاں چُنتے ہوئے دیکھا۔ عمر کے حساب سے مضبوط قد کاٹھی اور فراخ پیشانی دیکھ کر رحمت اللہ نے اُسے دال روٹی اور تھوڑے سے پیسوں پر فارم پر نوکر رکھ لیا۔ یہاں بیس برس کا ہو کے ببر یار خاں پہلے ببرا پھر ببن بھیا کہلانے لگا۔ مویشیوں کا سانی گوبر کرنے سے لے کر رحمت اللہ ٹھیکے دار کے لیے وقتاً فوقتاً ڈھیٹریوں چمارنوں کو ہموار کرنے تک سارے کام اس ببن بھیا کو نمٹانے ہوتے تھے۔ وہ تاراوگتے بیدار ہوتا تھا اور فارم کو چلانا شروع کرتا تھا۔ وہ دن بھر درد بھری آواز میں کچھ نہ کچھ گاتا رہتا تھا۔ وہ بالیوں کو ہل پھیرنے پر آمادہ کرتا تھا اور فصلوں کو اُگنے پر اکساتا تھا اور ایک بار کھلیانوں سے فارغ ہو کر جب گاؤں میں جبّرا بھری تھی اور ساگر سی پی سے ماسٹر صدیق اپنی منڈلی لے کر آیا تھا اور رات میں اُس نے ہارمونیم کے بٹن کرتے ہوئے سُروں میں گانا شروع کیا تھا کہ ؎

کم ہو گی جب چراغِ محبت کی روشنی
اسے دل کو جلا جلا کے اجالا کریں گے ہم

تو روتے روتے ببر یار خاں کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ اس لیے کہ فارم کے اس موسم بہار میں ببر یار خاں نے پہلی بار حرام کاری اور عشق کے مابین کسی فرق کو پہچاننے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں چندن پورے والے لالہ جی کی بال ودھوا بیٹی اُمید سے ہو گئی تھی۔ اور معاملہ بہت پیچیدہ ہو گیا تھا کیوں کہ فارم کے مالک رحمت اللہ ٹھیکے دار کا خیال تھا کہ لالہ کی بیٹی کے کسی معاملے میں خود اُس کو اپنی جمی جمائی عزت اور کھیتی باڑی دونوں سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ اُس ٹکیائی حرام زادی بال ودھوا نے رحمت اللہ ٹھیکے دار کو مروا ہی دیا ہوتا اگر اندھیرے میں چھوڑا ہوا ٹھیکے دار کا ایک تیر ٹھیک ببر یار خاں کی عشق سے پگھلی ہوتی چھاتی پر نہ جا لگتا۔ ببر یار خاں نے تین ہی چار سوالوں میں سب کچھ اُگل دیا۔

"ہاں۔ وہ چندن پورے والے لالہ کی بیٹی سے عشقِ حقیقی کرتا ہے۔"

"ہاں وہ اُس کو مسلمان کر کے اپنے نکاح میں لانا چاہتا ہے۔"

"بے شک وہ راتوں میں کبھی کبھی کھلیان پر آتی رہی ہے۔"

رحمت اللہ ٹھیکے دار نے سکون کا سانس لیا اور گاؤں والوں کی مدد سے ببر یار خاں کو پکڑ کر آم کے تنے سے باندھ دیا پھر بیدوں سے وہ مار لگائی کہ ٹھاکر تک کو سفارش کرنی پڑی کہ مر جائے گا حرامی ــــــ اب کھول دو سسرے مدرچ کو۔ اور سسرے مدرچ کو کھول کر سرکاری سڑک پہ پھنکوا دیا گیا۔

سرکاری سڑک سے اٹھائے جانے کے بعد ببر یار خاں پر وہ عمل شروع ہوا جو اُن بے وسیلہ لوگوں پر شروع ہوتا ہے جن کا کوئی سر دھرا نہ رہا ہو اور جو اچھی طرح مٹتے جا چکے ہوں۔ اور ببر یار خاں تو زخمی بھی بہت ہوا تھا۔ شاید اُس کے

گُردوں پر چوٹ پڑی تھی۔ کچھ دن اُسے پیشاب کے رستے خون آتا رہا پھر پیشاب ہی بند ہو گیا۔ بہرحال سڑک سے اُٹھانے والے بنجاروں نے سیاہ مُوصلی اور سفید موصلی پلا پلا کر اور اللہ واسطے لیپ چڑھا چڑھا کر اُسے لیٹے سے بٹھا دیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس کے بعد دھیرے دھیرے چلنے لگا۔

وقت بھی ایک بہت بڑے اسٹیم رولر کی طرح کوکتا ہوا ببر یار خاں پر سے آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔

ببر یار خاں نے شہر سے دُور پہاڑیا پے ایک جھونپڑی ڈال لی۔ محنت مزدوری کرنے لگا۔ پھر اُس نے ایک عورت ڈال لی۔ عورت بانجھ نکلی، اس لیے جھونپڑی سے ہر سال ببر یار خاں جیسے چھوٹے چھوٹے حرامی پلے جاری ہونے کی نوبت نہ آئی۔ کچھ دنوں بعد پہلے عورت بیمار ہوئی ببر یار خاں نے جی جان سے اُس کی خدمت کی، اُس کا میلا تک اُٹھایا، پھر وہ خود بیمار ہو گیا، عورت کسی کے ساتھ بھاگ گئی، وہ لشتم پشتم اچھا ہوا تو ایک اور عورت نے رحم کھا کے ببر یار خاں کو ڈال لیا۔ وہ عورت برابر والی جھونپڑی میں رہتی تھی اور رات پالی والے مِل مزدوروں کی دل بستگی کرتی تھی، یہی اُس کا ذریعۂ آمدنی تھا۔ اس عورت کے ساتھ رہتے ہوتے پہلے ببر یار خاں کے کپڑے میلے ہوتے پھر پھٹ گئے۔ عورت نے مِل مزدوروں سے کسب کیے ہوئے پیسوں سے مارکین کا ایک جوڑا بنوا دیا اور سخت بانات والی ایک ترکی ٹوپی خرید دی۔ ببر یار خاں ترکی ٹوپی پہن کر کمزور ٹانگوں سے چلتا ہوا پہاڑیا کی اُجڑی پُجڑی عید گاہ تک گیا اور اُس نے نمازِ دوگانہ ادا کی اور خدا کا شکر بجا لایا کہ وہ زندہ ہے۔

آگے چل کر وہ صرف اتنا ہی زندہ رہ گیا جتنی کہ سبزیاں زمین سے چپکی رہتے تک زندہ رہتی ہیں کیوں کہ مِل مزدوروں سے کسبِ زر کرنے والی اس عورت کے حوالے سے اُسے آتشک ہو گئی۔ اور وہ دوسرے تیسرے نشہ بھی کرنے لگا۔ اور اب اُسے کسی

طرح کی محنت کرنے کی ہمّت نہیں ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ پیسے کمانے کے کئی گُر بھی سیکھ گیا تھا۔ چوری اُن میں سے ایک اہم گُر تھا۔ کئی بار اُسے پولیس بھی لے جا چکی تھی۔ اُن بدنصیبوں نے اپنے روزنامچے میں ببر یار خاں کا نام ببّن ولد جھبریا خاں یا زکریا خاں لکھنے کے بعد پیشے کے خانے میں 'آوارہ گرد' لکھ رکھا تھا اور لکھا تھا کہ اس شخص کا ذریعۂ آمدنی نامعلوم ہے۔ شُبہ ہے کہ یہ عورتوں کی دلالی کر کے اپنا رزق حاصل کرتا ہے۔

خدا بڑا رزّاق ہے، وہ بڑا مُسبّب الاسباب اور بڑا مُنتقم ہے۔ وہ پتّھر کے شکم میں بیٹھے ہوئے کیڑے کو بھی سنگسار کرتا ہے۔

چنانچہ ایک دَہائی یا پتا نہیں دو دَہائیاں گزری ہوں گی کہ ببر یار خاں نے خود کو اُدھیڑ عمر کا پایا ــــ ۳۰ ــــ ۳۵ برس کا ایک ایسا اُدھیڑ آدمی جس کے بال اور دانت جھڑنا شروع ہو گئے تھے، جو نشے کی دست گیری کے بغیر رات کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ اور دفورِ آتشک سے جس کی بینائی جواب دیتی جا رہی تھی۔

اُسی زمانے میں کبھی پہلی بار ببر یار خاں ولد ظفر یار خاں کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اُسے وراثت سے محروم کرنے والے شاید ٹھیک ہی کہتے ہوں گے، اُس کی ماں فرخ زمانی بیگم عرف سنجھلی بہو عرف حُرمتِ مُتوّفیہ کا نکاح بالعوض اتنے اتنے سکّۂ رائج الوقت اُس کے باپ سے کبھی نہیں ہوا ہو گا ورنہ وقت کا اسٹیم رولر اُس پر سے کُوکتا ہوا اتنی سست رفتاری سے کیوں گزرتا۔ اس لیے ایک رات وہ جیسے تیسے شہر کے وسط میں پہنچا اور ایزد یار خاں کی حویلی تک گیا اور حویلی کے بلند دروازے کے سامنے جہاں اُس کے تایوں چچوں کی اولادوں کے موٹر آ کر رُکتے ہوں گے عین اُس جگہ وہ حوائجِ ضروری سے فارغ ہوا پھر طہارت کیے بغیر مزے سے چلا آیا۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

مزے کر مزے ۔ مزے کر مزے ۔ مزے کر مزے حرامی پلّے!

کچھ دُبدھائیاں ایسی گزری ہیں جن کے بارے میں ببر یار خاں کو یا اہلِ شہر کو کچھ نہیں معلوم۔ بس چتکبرے ڈیچن کو کہیں کہیں سے پتا ہو گا۔ ویسے یہ باتیں ڈیچن چتکبرے کو بھی نہ معلوم ہوتیں اگر اس رات زبردست آندھی بارش سے اُس کا چھپر نہ اُڑ گیا ہوتا۔ چھپر اُڑ گیا تو وہ اپنا ڈالڈے کا ڈبا اٹھائے لاٹھی ٹیکتا ہوا قبرستان والی باؤلی کے اُسارے میں آگیا۔ اُسارے میں وہ کبھی نہیں آتا اگر سڑک پر گھٹنوں گھٹنوں پانی نہ کھڑا ہوتا۔ سڑک نظر آ رہی ہوتی تو وہ سیدھا کیروانی مندر کا راستہ پکڑتا۔ وہ مندر میں نہیں گھستا۔ موٹا مہنت اُسے گھسنے ہی کب دیتا تھا۔ اس وقت اگر پناہ لینی ہوتی تو ڈیچن بس یہ کرتا کہ مندر کے کمپاؤنڈ تک پہنچتا، چار اینٹیں اوپر تلے رکھ کر اُن پر چڑھتا اور لاٹھی کی مدد سے اُچھل کر بندروں کے چبوترے میں پہنچ جاتا پھر رینگتا ہوا چبوترے کے لمبے طاق میں جا لیٹتا اور بارش رُکنے تک مزے سے سوکھے میں پڑا سوتا رہتا۔ یہ طاق اور یہ ترکیب سب کو معلوم تھی مگر ڈیچن کو ہمیشہ جگہ خالی ہی ملتی تھی۔ ٹھیک تو ہے وہاں لیٹ کے کیا کسی کو مرنا تھا؟

جو بھی تھا اب تو ڈیچن باؤلی کے اُسارے میں آگیا تھا اور پتھر کی جالی سے ٹیک لگائے مسلمانوں کے مُردوں کو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے نکل نکل کر بارش میں چھپا کے مارتے دیکھ رہا تھا۔ ڈیچن مُردوں سے خوف نہیں کھاتا تھا۔ زندوں سے بھی اُسے کچھ ایسا زیادہ ڈر نہیں لگتا ہو گا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ لوگ خود ڈیچن سے ڈرے ہوتے تھے۔ وہ اُسے دُور دُور رکھتے تھے۔ اصل میں ڈیچن کو چتکبرے کی بیماری تھی۔ اُس کی انگلیوں کا چمڑا اور ہونٹ اور پپوٹوں کے سرے سفید ہو چکے تھے۔ باقی چہرے پر بھی چتکبری بیماری نے بسنت کے چوکے پُور دیے تھے۔ گردن اور چھاتی کے چمڑے کی بھی یہی حالت تھی۔ لوگوں نے اُڑا رکھا تھا کہ یہ کوڑھ

ہے۔ اسی لیے چھوٹے بڑے ہندو مسلمان سب اُسے دُر دُر کرتے تھے اور دُور ہی سے پیسہ دو پیسہ پھینک کر اپنی جان چھڑا لیتے تھے۔ اِس طرح چنگبرے کی بیماری نے ڈلیچن کا وقت بچا دیا تھا۔ اُسے مانگنے میں زیادہ طاقت بھی نہیں لگانی پڑتی تھی۔ ویسے یہ ناانصافی کی بات تھی کہ لوگوں نے اتنی گندی بیماری کو اُس سے منسوب کر دیا تھا۔ اُس کا اپنا کوئی تھا نہیں جو اس ناانصافی کا بُرا مانتا اور ڈلیچن کے چھوٹے سے چتکبرے دل میں بُرا ماننے والا خانہ ہی نہیں تھا۔ بس اس لیے مزے سے گزارا ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تو غصّہ دکھا سکتا تھا۔ گالی بھی دے سکتا تھا۔ مگر طبیعت کی بات ہے، ڈلیچن کسی کو بھی ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس گندے موسم کو بھی اس وقت بڑی خوشامد سے مُسکرا مُسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ شکایت کر کے اسے اور خفا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اچانک بجلی چمکی اور ڈلیچن نے دیکھا کہ ایک مسلمان مُردہ بارش میں چھَپ چھَپ کرتا، ڈولتا، لہراتا ہوا اُسارے کی طرف آ رہا ہے۔ اُس نے پتّھر والی جالی کے قریب پہنچ کر ڈلیچن لکھیرے کی ماں کو گالی دی پھر زور زور سے ہاتھ ہلا کر اُسے یہاں سے چلے جانے کو کہا۔ ڈلیچن نے اُس کی بات کا بُرا نہیں مانا وہ جانے کی تیاری کرنے لگا۔ مگر اُس نے دیکھا مسلمان مُردہ ایک دم بُری طرح کانپنے لگا ہے پھر وہ پتّھر کے تڑختے ہوتے فرش پر ڈھیر ہو گیا اور دوبارہ مَر گیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈلیچن نے اُسے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ وہ ابھی مرا نہیں تھا۔ سردی میں کانپ رہا تھا۔ ویسے ہی بنا سوچے سمجھے یا شاید خوشامد میں، ڈلیچن نے اُسے اپنا پھٹا ہوا کمبل اُڑھا دیا، پھر فوراً ہی پچھتانے لگا اس لیے کہ ہَوا میں ابھی جاتی سردیوں کی کاٹ باقی تھی۔ ''اب جو بھی ہو'' ڈلیچن نے سوچا ''جو بھی ہو — کم سے کم یہ بک بک تو نہیں کرے گا۔ آرام سے تو بیٹھنے دے گا۔''

صبح جب ببر یار خاں کی آنکھ کھلی تو حسبِ معمول وہ اپنے لکڑ سکڑ دادا نواب اسفند یار خاں کے باغ میں تھے۔ جہاں سے کئی ہزار ٹوٹی ہوئی قبروں کی بچھات فی الحال سمیٹ لی گئی تھی اس لیے کہ رات کا خمار ابھی نہیں ٹوٹا تھا۔ چنانچہ ببر یار خاں سنگین باولی کے سائبان میں پشمینے کی نئی دولائی اوڑھے رات کی بارشوں اور بھیگے ہوئے مہکتے کنجوں اور بال ودھواؤں کے بارے میں سوچنے لگے۔ اچانک ہی سفید ہونٹوں والے ایک کالے پیلے بدصورت آدمی نے اُن پر جھکتے ہوتے بڑی خوشامد سے پوچھا "تم کون جات ہو بھیّا؟" "دھت تیرے کی! سب غارت ہو گیا۔ پشمینہ اور سائبان اور نواب اسفند یار خاں کی باولی اور باغ دجو انھیں باپ سے ترکے میں ملا تھا، اور جاتی سردیوں کی بارشوں میں بال ودھواؤں کے ساتھ سیرِ گلشن سبھی کچھ غارت ہو گیا۔ اس کی جگہ بجلی کے ایک فحش جھماکے نے آبائی قطعۂ باغ پر کئی ہزار ٹوٹی ہوئی قبروں کی بچھات پھیلا دی۔ یہ سفید ہونٹوں والا حرامی کہاں سے آ گیا؟ ببر یار خاں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اُس نے پھر پوچھا "کون جات ہو بھیّا تم؟ ببر یار خاں کچھ دیر سوچتے رہے، پھر بولے "گھس بیٹھیا ہوں"۔ "کا بھیّا؟ ہندو ہو مسلمان؟"۔ "نہ ہندو نہ مسلمان..... حرام کا پلّا ہوں..... تُو کون ہے؟" چیتھڑے آدمی نے بہت زیادہ خوشامد سے جواب دیا: "ڈیچن لکھیرا ہوں مالک..... یہ کمبل میرا ہے۔" ببر یار خاں کو ہنسی آ گئی "لکھیرا ہے؟ ایں؟ لاکھ کا آدمی؟..... خاک ہو گیا؟ تو بھی..... ایں؟" ڈیچن کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا مگر ہیں ہیں کر کے ہنسنے لگا۔

دونوں بدصورت آدمی ہنسنے لگے۔

خدا نے، یا جس نے بھی کائنات بنائی، ہنستے ہوئے بنائی ہو گی اور محبت میں بنائی ہو گی، اس لیے کہ چیزیں کسی غصّے، کسی انتشار میں یا بے تعلقی اور بے زاری

میں نہیں بنائی جاسکتیں کیونکہ بے زاری اور بے تعلقی موت کی سہیلیاں ہیں اور غصہ اور انتشار خرابی کے لیے پالک ہیں اور ان کا رنگ سیاہ اور زرد ہے اور ان کا رنگ کافور کی طرح سفید ہے اور یہ سفیدی سُمَن کے پھول کی سفیدی سے الگ ہے کہ سُمَن تو ہنسی کے پھول کا رنگ ہے کہ خدا کا رنگ ہے جب وہ روشنی اور مسرت میں ظہور کرتا ہے اور جب وہ چیزیں بناتا ہے۔ اور جب بناتا ہے اور الوہی مسرت میں ہنستا ہے اور بناتا ہے اور ہنستا ہے اور بناتا ہے۔

ببّر یار خاں کے لیے ایک ہنستے ہوتے چیتھڑے آدمی کا منظر بہت دیر تک ساکت رہا۔

ڈلیچن کا بکھرا ہوا چھپّر پھر کبھی نہ سمیٹا گیا۔ وہ قبرستان کی باؤلی میں اُٹھ آیا۔ ببّر یار خاں کو اُس کا خوشامد سے بات کرنا، اپنے پوپلے منھ سے انھیں مالک کہنا اور گھگھیا گھگھیا کر ہنسنا بھا گیا تھا۔ ٹوٹتے نشے کی ترنگ میں انھوں نے سوچا کہ میں باپ دادوں کے قطعۂ باغ پر قابض ہوں، اپنی جاگیر پر ہوں "مرے کر مرے، مرے کر مرے۔ مرے کر سالے جاگیر دار" سو یہ چیتھڑا میرا کارندہ، میرا اہالی، میرا حاضر باش ہے۔ "ہُوْ مالک"۔ انھوں نے ڈلیچن سے کہا تو چھپّر کے چکّر میں کیوں پڑتا ہے بے۔ باؤلی کے اُسارے میں بہت جگہ ہے "ہُوْ مالک" ہم دو ہی تو جانیں ہیں، ایک ایک کو نا سنبھال لیں گے۔ "ہُوْ مالک"۔

ڈلیچن چھپّر کے ملبے سے اپنا کنستر، گڑوی اور پیالہ رکابی اٹھا لایا۔ یہ اُس کی کُل کائنات تھی۔ اُس نے آتے ہی اُسارے کو اچھی طرح بُہارا اور اپنے کنستر میں باؤلی سے پانی لا لا کر تھِپَر کا تڑخا ہوا فرش دھو ڈالا۔ ببّر یار خاں نے اپنی جیبِ خاص سے دو روپے دے کر ڈلیچن کو بزریا بھیجا، پکوڑے منگوائے اور دونوں نے قبروں پر بیٹھ کر سہ پہر کا ناشتہ کیا۔

ایک دو روز بعد ڈلیچن نے باغ کی قبروں کے درمیان گھوم پھر کر اینٹیں جمع کیں اُن کا گھیرا بنایا اور گھیرے میں سوکھے پتے ٹہنیاں اور درختوں کی مُردہ چھال اکٹھا کر کے آگ جلادی، پھر اینٹوں پر پانی سے بھرا کنستر رکھ دیا۔ جب پانی خوب گرم ہو گیا تو وہ بڑی خوشامد سے ببّر یار خاں کو تہمد بندھوا کر اُسارے سے باہر لایا اور ڈالڈا کے ڈبّے میں مٹکے کا پانی سموسمو کر ببّر یار خاں پر ڈالنے لگا۔ ببّر یار خاں نے کھسیا کر اُسے گالیاں دیں اور کچھ دھندلی آنکھوں سے دیکھ کر کچھ ٹٹول کر لاٹھی اُٹھالی اور ڈلیچن کو بے دلی سے مارنے کی کوشش کی مگر لکھیرا لاٹھی کی زد سے دور ہی رہا۔ وہ دور سے بوڑھے آدمیوں والی پے ریا پوپلی ہنسی ہنستا رہا اور ڈبّے بھر بھر کر ببّر یار خاں پر گرم پانی ڈالتا رہا۔

لکھیرے بڑے جادوگر ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لاکھ تو زندہ درختوں کا آنسو ہوتی ہے پھر وہ اسی آنسو سے ہنستی کھلکھلاتی دھنک نکالتے ہیں۔ بڑے جادوگر ہوتے ہیں لکھیرے اس لاکھ کو اپنے ہاتھوں کی آگ دیتے ہیں اسے اپنے خوشی غمی کے رنگوں میں گوندھتے اور اچھالتے اور دائروں میں کھینچتے ہیں اور پھونکیں مار مار کر ٹھنڈا کرتے ہیں اور اس کھنکھناتے بجتے ہوئے دھنک میلے کو ہنستی ہوئی عورتوں کی کلائیوں میں پہنا دیتے ہیں۔ لکھیرے بڑے جادوگر ہوتے ہیں۔

کالی، پیلی انگلیوں والا ڈلیچن بھی جادوگر نکلا۔ اُس نے سسرے نے ببّر یار خاں کو، جو کسی زندہ درخت کا آنسو تھا اور بہت سی بے جان ریت اور مُردہ مٹّیوں سے مِل کر بنا تھا آگ دکھائی، اُسے اپنے ہاتھوں کی حرارت اور اپنی خوشی غمی کے رنگ دیے، اُسے اچھالا، دائروں میں کھینچا اور پھونکیں مار مار کر ٹھنڈا کیا۔ اور ڈلیچن اُسے بازار نہیں لے گیا۔ یہ بجتا کھنکھناتا ہوا دھنک میلہ اُس نے اپنے پاس ہی رکھا۔ اِس لیے کہ ہاتھوں سے کام کرنے والے ہر آدمی کے لیے کبھی نہ کبھی ایک دن ایسا آتا ہے

جب وہ چیزوں کو بازار میں نہیں لے جاتا۔ اپنے لیے بچا رکھتا ہے۔

اس مفت خورے ڈیکچن نے چار دہائیوں سے کچھ نہیں بنایا تھا۔ پر اَب جو اُس نے بنایا تو خوب بنایا۔ سفید ہونٹوں سے ہنستے ہوئے اُس نے ببر یار خاں کو قبرستان کی چٹائی سے اٹھایا اور پتھر کی عمودی جالی سے ٹکا دیا۔ ببر یار خاں کی آنکھوں کا چیپڑ صاف کیا تاکہ وہ کم نصیب اپنے خوابوں کو اور زیادہ صاف اور رنگین کر کے دیکھ سکے۔ اور ڈیکچن نے اس کی چھاتی کھول کر دیکھی۔ اپنے گھاؤ اسے دِکھلاتے۔ اُس کے لیے دھیمے دھیمے رُویا۔ اُسے رلایا۔ اُس کی مار کھائی اُسے گالیاں دیں۔ اُس کے لیے روٹی اور نشے کی چیزیں لایا۔ اُس کے پیسے چُرائے۔ اُس کے لیے چوریاں کیں اور اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ پھر لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ بے بس اندھا حرام زادہ اپنی گندگی میں لتھڑا ہوا مکھیوں کے بادل سے ڈھکا ہوا پڑا ہے۔ لکھیرے نے اُسے لاتوں سے مارا، لکڑی کا غذ کپڑے سے صاف کیا، گرم پانی سے دھویا اور پھر پتھر کی عمودی جالی سے ٹکا دیا۔ شہر اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ کسی نے ۔۔۔۔ کسی ایک نے بھی ان دو بدصورت آدمیوں کو نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ مسلمانوں کے متروک قبرستان میں گیدڑوں اور قبر بجّوؤں اور چوری چھپے نشہ کرنے والوں اور چوری چھپے حرام کرنے والوں اور لُٹیا چوروں کی معیّت میں زندہ تھے اور پھل پھول رہے تھے۔ ببر یار خاں جب حواسوں میں ہوتے تھے تو ڈیکچن کو "ڈُلی دا" جو ڈلی چن دادا کا مخفف تھا یا "لکھیرا جی" یا "لالہ" کہتے تھے۔ جو اس چیکبرے کو کبھی کسی نے نہیں کہا تھا۔ اِن ناموں رشتوں کی موسیقی اُس کے کالے پیلے کانوں میں پہروں گھنٹیاں بجاتی رہتی تھی۔ لکھیرا جب بَنّن کھاں صاحب کے لیے پیار محسوس کرتا تو انھیں "مالک" یا "ببّر بھیّا" کہتا تھا۔ غصہ ہوتا تھا تو چلا جاتا تھا۔ مگر اُسارے میں بہت سا پانی اور علی گڑھ والے بسکٹ چنے یا پکوڑے اور ایک آدھ بوتل میں دارو

چھوڑ جاتا تھا۔ یہ اس ترکے سے بہتر تھا جو مشجّر کی شیروانی والا، میاں، اپنے ببر یار خاں کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اس پانی بسکٹ اور دارو تک ہاتھ بڑھایا جا سکتا تھا اسی لیے ببر یار خاں اس سے خوش ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ بوتل خالی کرنے سے پہلے ڈیپچن کے لیے دعا کرتے تھے۔ دعا کے الفاظ ہمیشہ یہی ہوتے تھے کہ اس سالے چینکبرے کو اللہ خوش رکھے آمین۔

یہ دو متروک آدمی، دونوں میں سے کسی ایک کی طبعی موت آنے تک، اسی طرح ایک دوسرے کی سنگت میں زندہ رہ سکتے تھے اس لیے کہ دونوں اس طرح مگن بہت تھے۔ اس سے زیادہ انھیں چاہیے بھی کیا تھا لیکن شہر نے کروٹ لے لی۔ (آدھی رات کے وقت شہر کا پیٹ ایک آواز کے ساتھ شق ہوا اور ہلاک کرنے والے دھوئیں کا سفید دریا روتے کھانستے مرتے ہوئے شہر پر سے بہنے لگا۔ پانچ لاکھ آدمیوں نے اندھے شہر کی چیختی ہوتی سڑکوں پر دوڑنا شروع کر دیا۔ ان میں سے کئی ہزار اس شہر کی لال مٹّی میں پسر گئے اور ایڑیاں رگڑتے ہوئے دم توڑنے لگے۔) کہر کی شکل بنائے ہوئے یہ موت اسفندیار خاں کے قطعۂ باغ میں بھی آئی اور اس نے ببر یار خاں کو اور ڈیپچن کو گلے سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

موت کے قرب نے ببر یار خاں کا نشہ ہرن کر دیا تھا۔ پہلی بات جو انھوں نے بیدار حواسوں کے ساتھ سوچی یہ تھی کہ موت اچانک واقع ہو رہی ہے۔ شہر کے مسلمان تو سارے ہی شہادت کے مرتبے پر فائز ہوں گے اور انشاءاللہ جنّت الفردوس میں جگہ پائیں گے۔ مگر مرنے کا خوف اتّفاقیہ شہادت کی اس نوید پر فوراً ہی غالب آ گیا۔ انھوں نے کھانستے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی، اٹھ نہ سکے لرزنے لگے۔ لمحے بھر بعد انھیں اس خیال سے پھر تقویت ملی کہ ان جیسے بداعمال آدمی کو مرنے کا ایسا اچھا موقع پھر کب نصیب ہوگا۔ مسلمان تو سارے ہی شہادت کے مرتبے پر۔۔۔۔۔

اس بات کو ڈُلیچن لکھیرا انہیں سمجھ سکتا تھا۔ پہلے وہ اٹھ کر بھاگا باغ کی حدبندی سے باہر نکل گیا مگر وہ اندھے کو مرنے کے لیے چھوڑے جا رہا تھا۔ سو اُس نے خود کو ملامت کی اور پیروں سے ٹٹولتا ہوا اور کھانستا ہوا واپس اُساسرے میں آگیا۔ اُس نے جیوٹ کر کے ہڈیوں کے اُس ڈھانچ بَبر یار خاں کو کمر پر لادا اور قبرستان کی حدبندی سے باہر نکل گیا۔ آگے ٹھنڈی سڑک پر دھوئیں کا دودھیا دریا غرّاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ڈُلیچن کی آنکھیں جواب دے چکی تھیں۔ اس کے پھیپھڑے پھٹنے کو ہوتے تو اُس نے بَبر یار خاں کو سڑک کے کنارے نصب کی ہوئی سرکاری بنچ پر لٹا دیا۔ کمزوری سے کھانستا ہوا ہڈّیوں کا یہ ڈھانچ تشنّج میں کھٹکے کے چاقو کی طرح کھُلا، بند ہوا، پھر بنچ سے نیچے جا گرا۔ ڈُلیچن نے سوچا وہ تو بھاگ کر اپنی جان بچائے مگر ہر طرف ہلاک کرنے والے دھوئیں کا دریا تھا جس کا کوئی اور چھور نہیں تھا۔ ڈُلیچن خالی بنچ پر گر گیا اور یَمّ دُوت کا انتظار کرنے لگا۔ اُس نے سوچا جان نکلنے میں اب کوئی دیر نہیں ہے۔ سو ڈُلیچن نے یاد کیا کہ اس نے کمزوروں پر سختی نہیں کی تھی۔ گھگھیا گھگھیا کے زندگی گزاری تھی۔ "میں خود کمزور تھا پربھو۔ میں نے جیو جانور کو بھی نہیں ستایا۔ دونوں ہاتھ باندھ کر بَسر کردی مالک! ۔ تو اَب یَمّ دُوت کا ہاتھ میری جان کو نرمی سے کھینچ لے"۔ پھر بڑی مسرت سے ڈُلیچن نے سوچا۔ "میں تو کرُونا مُے گرِیجا پتی کا بھکت ہوں، سیدھا سُورَگ میں جاؤں گا"۔ بنچ کے نیچے بَبر بھیّا بُری طرح کھانسنے لگا۔ "مگر اس اندھے کا کیا بنے گا، یہ تو مسلمان ہے؟" ڈُلیچن اُسے باغ سے لے آیا تھا سڑک پہ کیسے چھوڑ جاتا۔ پھر اُس نے دودھ کے دریا میں یَمّ راج کی سواری آتے دیکھی اور —— گَج بدن بھینسے کی دھمک سُنی "ہے پرمیشور! اگر یہ یَمّ راج کی پَد دھَونی ہے تو اب اس مسلمان کی بھی رکھشا کر دے۔ مالک! یہ اندھا نَرک اَندھکار میں اکیلا کہاں مارا مارا پھرے گا۔ روشنی دکھا دے اِسے بھی پَربھو!"

کاسٹ آئرن اور لکڑی سے بنی ہوئی مضبوط بنچ کے نیچے پڑے پڑے ببر یار خاں کی بے نور پتلیوں کے پیچھے خیال میں تراشا ہوا ایک مہیب پیکر ہیولا ہو گیا۔ اُن کی مُردہ آنکھوں نے ایک سیاہ ڈیل ڈول دیکھا اور مرتے ہوئے کانوں نے بھاری قدموں کی دھمک سُنی۔

وہ یم راج تھا جو اس بھٹکے ہوئے اندھے ببر بھیّا کی رکھشا کرنے اُسے سُورگ میں لے جانے کے لیے آگیا تھا۔ وہ ڈیچن کی سفارش پر آیا تھا (''وہاں بھی مالک کی مہربانی سے جوڑی بنی رہے گی'' یہ سوچتے ہوئے ڈیچن کا چھوٹا سا چنچرا دل خوشی سے بھر گیا۔)

''اِس سالے چنچرے کو اللہ خوش رکھے آمین۔''

ٹھیک اُسی وقت بنچ کے نیچے پڑے ببر یار خاں نے ڈیچن کے لیے دُعا مانگی کہ غفور الرحیم اِس نے میرے ساتھ بہت نیکیاں کی ہیں۔ ابھی اس کا دم آخر نہیں ہوا ہے نواز دے اِسے مسلمان کر دے مولا۔ یہ جہنم میں کہاں مارا مارا پھرے گا، اکیلا ہے سُسرا۔

تو غفور الرحیم نے سفارش منظور فرمائی اور ببر یار خاں کی ڈوبتی ہوئی سماعت میں حیرت ناک صحت تلفظ کے ساتھ کلمۂ شہادت کے الفاظ آنا شروع ہوئے۔ انھوں نے سُنا۔ کاسٹ آئرن اور لکڑی سے بنی ہوئی مضبوط بنچ کے اوپر پڑے پڑے کوئی ایڑیاں رگڑتا ہوا پوپلی آواز میں ایمان لا رہا تھا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ شہادت دیتا ہوں کہ شہادت دیتا ہوں . . . .

شکر گزاری میں ببر یار خاں کی مُردہ آنکھوں سے پانی بہہ نکلا: ''مولا! تُو نے بالکل آخری وقت میں ایک مُشرک کو مُشرّف بہ اسلام کیا ہے۔ تیری رحمت کے صدقے جاؤں پروردگار۔''

پھر کاسٹ آئرن اور لکڑی سے بنی ہوئی مضبوط بنچ کے نیچے پڑے پڑے

بَبر یار خاں ولد ظفر یار خاں نے آسودگی سے ٹانگیں پھیلائیں اور جان دے دی۔

دو گھس بیٹھیے حرام خور ایک دوسرے کی سنگت میں کھانستے ہوئے خدا کے اَبدی مرغزار میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

باسوڈے کی مریم

مریم کے خیال میں ساری دنیا میں بس تین ہی شہر تھے۔ مکّہ، مدینہ اور گنج باسوڈہ۔ مگر یہ تین تو ہمارا آپ کا حساب ہے، مریم کے حساب سے مکّہ، مدینہ ایک ہی شہر تھا: "اپنے حجور کا سہر"۔ مکّے مدینے سریپ میں اُن کے حجور تھے اور گنج باسوڈے میں اُن کا ممدو۔

ممدو اُن کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اُس کے رخسار پر "اتّا بڑا" ناسور تھا۔ بعد میں ڈاکٹروں نے ناسور کاٹ پیٹ کر رخسار میں ایک کھڑکی بنا دی تھی جس میں سے ممدو کی زبان پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپتی رہتی تھی۔ مجھے یاد ہے، پہلی بار مریم نے اماں کو سرجری کا یہ لطیفہ سنایا تھا تو میں کھی کھی کر کے ہنسنے لگا تھا۔ اگر مریم اپنے کھردرے ہاتھوں سے کھینچ کھانچ کر مجھے اپنی گود میں نہ بھر لیتیں تو میری وہ پٹائی ہوتی کہ رہے نام اللہ کا۔ "اے دُلھین! بچّہ ہے۔ بچّہ ہے ری دُلھین! بچّہ ہے۔" مگر اماں نے غصّے میں دو چار ہاتھ جڑ ہی دیے جو مریم نے اپنے ہاتھوں پر روکے اور مجھے اٹھا کر اپنی کوٹھری میں قلعہ بند ہو گئیں۔ میں مریم کے اندھیرے قلعے میں بڑی دیر تک ٹھُس ٹھُس کر کے روتا رہا۔ وہ اپنے

اور میرے آنسو پونچھتی جاتی تھیں اور چیخ چیخ کر خفا ہو رہی تھیں۔" اے ری دُلھین،
یہ اللہ کی دَین ہیں... نبی کے اُمتی ہیں۔ انہیں مارے گی، کوٹے گی تو اللہ نبی
کُھش ہوں گے تجھ سے؟ توبہ کر دُلھین! توبہ کر۔"

پھر وہ طرح طرح سے کھڑکی اور مچھلی والا لطیفہ سنا سنا کر مجھے بہلانے لگیں۔
"تو بیٹا ڈانگدروں نے کیا کیا کہ حرامیوں نے ممدو کے گال میں کھڈکی بنا دی اور
کھڈکی میں سے تھرک تھرک، تھرک تھرک..." مریم کا دل بہت بڑا تھا اور
کیوں نہ ہوتا، اُس میں اُن کے حجور کا مکہ مدینہ آباد تھا اور سینکڑوں باسوے
آباد تھے۔ جن میں ہزاروں لاکھوں گل گُتھنے ممدو اپنی گول مٹول مٹھیوں سے
مریم کی دودھوں بھری ممتا پر دستک دیتے رہتے تھے" اتا بُوا! دروازہ کھولو۔
اللہ کی دَین آئے ہیں۔ نبی کے اُمتی آئے ہیں۔"

مریم نے میرے ابا کو دودھ پلایا، وہ میری کھلائی اور میری پناہ تھیں، وہ
میرے بھانجے بھانجیوں کی اتا تھیں اور ابھی زندہ ہوتیں تو ابھی بھانجے بھانجیوں
کے بچّے اپنے چارج میں لیے بیٹھی ہوتیں۔ میری تین پشتوں پر مریم کا احسان ہے۔

میں نے ایک بار مریم کے قلعے میں گھس کر اُن کی پٹلیا سے گڑ کی ایک
بھیلی چرا لی۔ مریم بچّوں کو بگاڑنے والی مشہور تھیں مگر مجال ہے جو بڑے
جرائم میں کسی کی حمایت کر جائیں۔ انہوں نے فوری طور پر اماں سے میری
رپورٹ کر دی اور اماں، خدا انہیں خوش رکھے، جاگیردار کی بیٹی، کھری پٹھانی
اپنی اولاد سے کوئی گھٹیا فعل منسوب ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ انہوں نے
جلال میں آکر اُلٹا مریم سے اَن بولا کر لیا۔

ابا کو پتا ہی نہ تھا کہ گھر میں سرد جنگ جاری ہے۔ وہ اُسی طرح عشا
کی نماز کے بعد پندرہ بیس منٹ کے لیے مریم کے پاس بیٹھ کر اُن کا

حال احوال پوچھتے، مریم کے پاؤں دابنے کی کوشش کرتے اور ان کی پیار بھری جھڑکیوں کی دولت سمیٹ کر اپنے کمرے میں سونے چلے جاتے۔

تین چار دن میری یہ دو جنتیں ایک دوسرے سے برگشتہ رہیں اور میں گنہگار عذاب جھیلتا رہا۔ اماں نے مریم کی دیکھ بھال میں کوئی کوتاہی تو نہ کی مگر مریم کا سامنا ہو جاتا تو اماں کے نازک خدوخال آپ ہی آپ سنگ و آہن بن جاتے۔ مریم زیادہ تر اپنی کوٹھری میں محصور رہیں اور شاید روتی رہیں، آخر چوتھے پانچویں دن میں پھوٹ بہا اور پٹائی کے خوف سے بے نیاز ہو کر اماں کی گود میں سر رکھ کر میں نے اقبالِ جرم کر لیا۔ اماں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ بس ایک غضب کی نگاہ کی، مجھے ایک طرف دھکیل کر اُٹھ کھڑی ہوئیں اور بجلی کی سی تیزی سے مریم کے قلعے میں داخل ہو گئیں "اتا بوا! تمہارا منجھلا تو چور نکلا۔ بُوا! ہمیں معاف کر دو۔" میں نے کواڑ کی آڑ سے دیکھا کہ مریم لرزتے ہاتھوں سے اماں کے دونوں ہاتھ تھامے انہیں چوم رہی ہیں۔ کبھی ہنستی ہیں، کبھی روتی ہیں اور کبھی اماں کو چپت لگانے کا ڈراما کرتی ہیں "بس ری دلھین! بس کر، چپ ری دُلھین! چپ کر۔ دیکھ، میں مار بیٹھوں گی۔"

مریم سیدھی سادی میواتن تھیں۔ میری خالہ سے مرتے دم تک صرف اس لیے خفا رہیں کہ عقیقے پر ان کا نام فاطمہ رکھ دیا گیا تھا "ری دُلھین! بی بی پھاطمہ تو ایکئی تھیں۔ نبی جی سرکار کی سہجادی تھیں، دنیا آکھرت کی باچھا تھیں۔ ہم دوجخ کے کُندے بھلا اُن کی برابری کریں گے۔ توبہ توبہ استگپھار۔"

محرّم میں نویں اور دسویں کی درمیانی شب وہ خشوع و خضوع سے تعزیے، سواریاں اور اکھاڑے دیکھتیں، خوب خوب پاپڑ پکوڑے کھاتیں کھلاتیں اور دسویں کو صبح ہی سے "دجو بنا کے" بیٹھ جاتیں، ہم لڑکوں کو پکڑ پکڑ کر دن بھر شہادت نامہ

سنتیں یا کلمۂ طیبّہ کا ورد کرتیں، اور خدا مغفرت کرے، کلمہ شریف بھی جس طرح چاہتیں پڑھتیں "لاالا ہا ال لِلاّ نبی جی رسول اِلاّ۔ جموُر جی رسول اِلاّ۔"

امام حسینؓ کا نام لے لے کر بین کرتیں، رو رو کر آنکھیں سُجا لیتیں اور بین کرتے کرتے گالیوں پر اُتر آتیں "رے حرامیوں نے میرے سہجادے کو مار دیا۔ رے ناس مٹوں نے میرے باچھا کو مار دیا۔"

محرّم میں وہ ہم لڑکوں کو حسنؓ حسینؓ کے فقیر بناتی تھیں۔ ہمارے کُرتے ہرے رنگ دیتیں۔ گردنوں میں کلاوے ڈال دیتیں اور چھوٹی چھوٹی بٹونیاں سی کر اُن میں دو دو آنے کے پیسے ڈال، سیفٹی پنوں سے ہمارے گریبانوں میں ٹانک دیتی تھیں۔

حق مغفرت کرے، ہمارے دادا میاں مرحوم تھوڑے سے وہابی تھے۔ ابا بھی اُن سے کچھ متاثر ہی پر محرّم کے دنوں میں مریم کے آگے کسی کی وہابیت نہ چلتی۔ دس روز کے لیے تو بس مریم ہی ڈکٹیٹر ہوتیں مگر یہ ڈکٹیٹری بھی 'جیو اور جینے دو' کے اصول پر چلاتی تھیں۔ ہمیں فقیر بنا کر چپکے سے سمجھا دیتی تھیں "دیکھ رے بیٹا! بڑے میاں جی کے سامنے متی جانا۔"

اور بڑے میاں جی بھی، خدا اُن پر اپنی رحمتوں کا سایہ رکھے، کمال بزرگ تھے۔ ظاہر تو یہ کرتے تھے جیسے مریم کی ان باتوں سے خوش نہیں ہیں۔ پر ایک سال محرّم کے دنوں میں مریم باسودے چلی گئیں۔ ہمارے گھر میں نہ شہادت نامہ پڑھا گیا، نہ ہائے حسینؓ ہوئی، نہ ہم فقیر بنے۔ عاشورے پر ہم لڑکے دن بھر ہاکی کھیلتے رہے۔ عصر کی نماز پڑھ کر دادا میاں گھر لوٹ رہے تھے۔ ہمیں باڑے میں اُدھم مچاتے دیکھا تو لاٹھی ٹیک کر کھڑے ہو گئے "ابے کرشٹانو! تم حسنؓ حسینؓ کے فقیر ہو؟ بڑھیا نہیں ہے تو جانگیے بہن کے اُدھم مچانے لگے۔ یہ نہیں ہوتا کہ آدمیوں کی

طرح بیٹھ کے یاسین شریف پڑھو۔"

یاسین شریف پڑھو حسنؓ، حسینؓ کے نام پر، یاسین شریف پڑھو بڑے میاں جی کے نام پر، یاسین شریف مریم کے نام پر اور ان کے ممدو کے نام پر کہ ان سب خوبصورت ناموں سے تمہاری یادوں میں چراغاں ہے۔

مگر میں ممدو کو نہیں جانتا۔ مجھے صرف اس قدر علم ہے کہ ممدو باسودے میں رہتا تھا اور ڈانگدروں نے اس کے گال میں ایک کھڈکی بنادی تھی اور اس کھڑکی کے پٹ مریم کی جنت میں کھلتے تھے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب مریم بڑے سوز کے ساتھ کھواجہ پیا جرا کھولو کوڑیاں گاتی تھیں تو اماں کی کوئلوں جیسی آواز اُن کی آواز میں شامل ہو کر مجھ پر ہزار جنتوں کے دروازے کھول دیتی تھی۔ میں اماں کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ جاتا اور خواجہ پیا کو سُروں کے معصوم جھروکے سے درشن بانٹتے دیکھا کرتا۔ سُنا ہے میری اماں موج میں ہوتی ہیں تو اب بھی گاتی ہیں۔ خدا انہیں ہنستا گاتا رکھے پر مریم کی آواز تھک کر سو چکی ہے یا شاید ایک لمبے سفر پر روانہ ہو چکی ہے اور مکّے مدینے سر پیپ کی گلیوں میں پھول بکھراتی پھر رہی ہے یا باسودے کے قبرستان میں ممدو کو لوریاں سنا رہی ہے۔

سفر مریم کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ وہ حج کرنا چاہتی تھیں۔ ویسے تو مریم ہمارے گھر کی مالک ہی تھیں مگر پتا نہیں کب سے تنخواہ لے رہی تھیں۔ ابّا بتاتے ہیں کہ وہ جب اسکول میں ملازم ہوئے تو انہوں نے اپنی پہلی تنخواہ مریم کے قدموں میں لاکر رکھ دی۔ مریم پھول کی طرح کھل اُٹھیں، اپنی گاڑھے کی چادر سے انہوں نے ایک چوّنی کھول کر ملازمہ کو دی کہ جا بھاگ کے بجار سے ذرلے بیاں لیا۔ مریم نے خود ان جلیبیوں پر کلمہ شریف پڑھا اور تنخواہ اور جلیبیاں اُٹھا کر بڑے عزور کے ساتھ دادا میاں کے سامنے رکھ آئیں "بڑے میاں جی! مُبارک ہو۔

دُولھے میاں کی تنکھا مِلی ہے۔" پھر اس تنخواہ میں سے وہ بھی اپنی تنخواہ لینے گئیں، جو پتا نہیں انہوں نے ایک روپیا مقرّر کی تھی کہ دو روپے۔

مریم کا خرچ کچھ بھی نہیں تھا۔ باسودے میں ان کے مرحوم شوہر کی تھوڑی سی زمین تھی جو ممدو کے گزارے کے لیے بہت تھی اور بکریاں تھیں جن کی دیکھ بھال ممدو کرتا تھا۔ بڑا لڑکا شتاب خاں ریلوائی میں چوکیدار تھا اور مزے کرتا تھا۔ برسوں کسی کو پتا نہ چلا کہ مریم اپنی تنخواہوں کا کرتی کیا ہیں۔ پھر ایک دن وہ ڈھیر سارے کل دار روپے میلے کچیلے نوٹ اور ریزگاری اُٹھائے ہوئے ابّا کے پاس پہنچیں اور انکشاف کیا کہ وہ حج کرنے جا رہی ہیں۔ کرلئے کی یہ رقم ان کی برسوں کی کمائی تھی۔ یہ مکّہ مدینہ فنڈ تھا جو مریم خبر نہیں کب سے جمع کر رہی تھیں۔ ابّا نے گن کر بتایا کہ نو سینکڑے تین بیسی سات روپے کچھ آنے ہیں۔ مریم کو اس سے غرض نہیں تھی کہ یہ کتنے ہیں، وہ تو سیدھی سی بات پوچھ رہی تھیں کہ ان سے مکّے مدینے کا ٹکس مل جائے گا یا نہیں۔ ابّا نے بتایا کہ بے شک مِل جائیگا۔

مریم نے تیّاریاں شروع کر دیں۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے گنگناتی رہتیں کہ کھواجہ پیا جرا کھولو کِواڑیاں۔ اُن پر مکّے مدینے کی کھڑکیاں کھلی ہُوئی تھی اور اُن کھڑکیوں سے نبیؐ جی کے مقدّس پیراہن کی خوشبو چلی آ رہی تھی۔ کسی نے چھیڑنے کو کہہ دیا کہ تم کو ڈھنگ سے نماز پڑھنی تو آتی نہیں، قرآن شریف تو یاد نہیں ہے، پھر حج کیسے کرو گی؟

مریم بپھر گئیں "رے مسلمان کی بیٹا، مسلمان کی جورو ہوں۔ نماج پڑھنا کا ہے نہیں آتی۔ رے کلمہ سریپ سن لے، چاروں گل سن لے اور کیا چہیئے تیرے کو؟ ہاں اور کیا چہیئے تیرے کو؟ پھر اُن کے دل میں تو نبیؐ جی کے پیار کا چمن بھی کھلا ہُوا تھا کہ یہی بہت تھا۔

مگر ایک دن شتاب خاں کا خط آیا کہ ممدو کی حالیت کھراب ہے، بکریاں بیچ باچ کے علاج مالجہ کرایا، جمین گروی رکھ دی۔ اب بالکل پیسے نئیں ہیں۔ صورت دیکھنا چاہتی ہے تو خط کو تار سمجھنا۔ مریم کی آنکھوں میں مکہ مدینہ دھندلا گیا۔ انہوں نے نو سینکڑے تین بیسی سات روپے چادر میں باندھے اور روتی پیٹتی باسودے کی بس میں جا بیٹھیں۔ ابا ساتھ جانا چاہتے تھے انہیں سختی سے منع کر دیا۔

ممدو تو اُن کی ذمے داری تھا، وہ کسی اور کو اُس میں کیوں شریک کرتیں۔ مریم کا یہ اصول بڑا سفاک تھا۔ انہوں نے باسودے سے خیریت سے پہنچنے کا خط تو لکھوا دیا پر ممدو کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھوایا۔ مہینے گزر گئے۔ کسی نے بتایا کہ وہ ممدو کو علاج کے لیے اندور لے گئی ہیں، پھر پتا چلا کہ بمبئی میں صابو صدیق کی سرائے میں نظر آئی تھیں، پھر پتا چلا کہ ممدو مر گیا ہے۔ پھر ایک لٹی لٹائی مریم گھر لوٹ آئیں۔

میں اسکول سے گھر پہنچا تو دیکھا کہ مریم صحن میں بیٹھی اپنے مرے ہوئے بیٹے کو کوس رہی ہیں "ورے حرامی! تیرا ستیاناس جائے رے ممدو! تیری ٹھٹھری نکلے۔ اورے بد جناور تیری کبر میں کیڑے پڑیں۔ میرے سبرے پیسے کھرچ کرا دیے رے ری دُلھین! میں مکے مدینے کیسے جاؤں گی۔ بتا ری دُلھین! اب کیسے جاؤں گی؟"

ابا نے کہا "میں تمہیں حج کراؤں گا۔"

اماں نے کہا "اتا بوا، ہم اپنے جہیز والے کڑے بیچ دیں گے، تمہیں حج کرائیں گے۔"

مگر مریم چپ نہ ہوئیں، دو دن تک روتی رہیں اور ممدو کو کوستی پیٹتی رہیں۔ لوگوں نے سمجھایا کہ آخر دولھے میاں بھی تو تمہارا ہی بیٹا ہے، وہ اگر تمہیں حج کراتا ہے تو ٹھیک ہے، مان کیوں نہیں جاتیں؟ مگر مریم تو بس احسان کرنا جانتی تھیں،

کسی بیٹے کا بھی احسان اپنے سر کیوں لیتیں۔ انہوں نے تو اپنی کمائی کے پیسوں سے حج کرنے کی ٹھانی تھی۔

ممدو کے مرنے کے بعد مریم شاید ایک دفعہ اور باسودے گئیں اپنی زمین کا تیا پانچا کرنے پھر اس کے بعد باسودے کا زوال شروع ہو گیا۔ مریم کے چوڑے چکلے میواتی سینے میں بس ایک ہی شہر بسا رہ گیا۔ اُن کے حجُور کا سہر۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے "نبی جی، حجُور جی" کرتی رہتیں۔ کبھی تو یوں لگتا کہ انہیں قرار سا آگیا ہے۔ شاید اس لیے کہ اُن کے بھولے بھالے منصوبہ کار ذہن نے ایک نیا مکہ مدینہ فنڈ کھول لیا تھا۔

ابا نے بڑے شوق سے لحاف سلوا کر دیا، مریم چپکے سے جا کر بیچ آئیں۔ عید آئی مریم کے بھی کپڑے بنے، خدا معلوم کب، کتنے پیسوں میں وہ کپڑے بیچ دیے۔ ابا اماں سمیت، ہم سب کو جو ایک ایک آنہ عیدی دیتی تھیں، فوری طور پر بند کر دی۔ پیسا پیسا کر کے پھر مکہ مدینہ فنڈ جمع ہو رہا تھا۔ سب ملا کر ابھی پانچ سو ساٹھ روپے ہی جمع ہوئے تھے کہ مریم کا بلاوا آگیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ کب اور کس طرح چل بسیں۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنی خالہ کے گاؤں گیا ہوا تھا واپس آیا تو مجھے دیکھ کر اماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ "منجلے! تیری انا بوا گزر گئیں۔ لڑکے تجھے بگاڑنے والی گزر گئیں۔"

ابا نے مجھے حکم دیا کہ میں مریم کی قبر پہ ہو آؤں، میں نہیں گیا۔ میں کیوں جاتا، ٹھنڈی مٹی کے ڈھیر کا نام تو مریم نہیں تھا۔ میں نہیں گیا۔ ابا ناراض بھی ہوئے مگر میں نہیں گیا۔

لوگوں نے بتایا کہ مریم نے مرتے وقت دو وصیتیں کی تھیں۔ ایک وصیت تو یہ تھی کہ تجہیز و تکفین انھی کے پیسوں سے کی جائے اور باقی کے پیسے شتاب خاں

کو بھیج دیے جائیں۔ دوسری وصیّت کا صرف امّاں کو علم تھا۔ امّاں کے کان میں انہوں نے مرتے وقت کچھ کہا تھا جو امّاں کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھیں۔

میں یہاں آگیا۔ پندرہ برس گزر گئے۔ ۶۵ء میں ابّا اور امّاں نے فریضۂ حج ادا کیا۔ امّاں حج کر کے لوٹیں تو بہت خوش تھیں، کہنے لگیں "منجلے میاں! اللہ نے اپنے حبیبؐ کے صدقے میں حج کرادیا۔ مدینے طیّبہ کی زیارت کرادی اور تمہاری انا بُوا کی دوسری وصیّت بھی پوری کرائی۔ عذاب ثواب جائے بڑی بی کے سر، میاں ہم نے تو ہرے بھرے گنبد کی طرف منہ کر کے کہئ دیا کہ یارسول اللہ! باسودے والی مریم فوت ہوگئیں۔ مرتے وخت کہہ رئی تھیں کہ نبیؐ جی سرکار اہیں آتی ضرور مگر میرا ممدو بڑا حرامی نکلا۔ میرے سب پیسے خرچ کرادیے۔"

❋

مٹی دادا

مایا کے تین ناموں کی طرح مٹی دادا کے بھی تین نام تھے: مجیتا — مجید اور مٹی دادا۔ مجیتا کہنے والے اُن کے سامنے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجید یا 'ارے مَاں مجید' کہنے والے دو تین بڑے بوڑھے اُن کے بعد بھی کچھ دن زندہ رہے۔ باقی تمام لوگوں کے لیے، سارے شہر، سب زمانوں کے لیے وہ مٹی دادا تھے۔

خود مٹی دادا کا بیان تھا کہ اُن کا اصل نام 'اَبدُل مزید کھاں ایشپ جیَ' ہے۔ چنانچہ پولیس کے مشیر ناموں، راشن کارڈوں، سرکاری اسپتال کے کاغذوں اور آخر میں قبرستان کے رجسٹر میں اُن کا نام عبدالمجید خاں یوسف زئی لکھا گیا۔ اگر اُن کا کوئی وارث ہوتا تو لوحِ مزار پر بھی عبدالمجید خاں یوسف زئی ہی لکھا جاتا۔ اس لیے کہ اُن کی وصیّت یہی تھی۔ مٹی دادا کے بارے میں محلّے کے دھوبیوں نے اڑا رکھا تھا کہ وہ ذات کے ہندو تیلی ہیں اور ان کی مسلمانیاں تک نہیں ہوئی ہیں۔

دھوبیوں کی اس حرمزدگی کی وجہ خود مٹی دادا یہ بیان کرتے تھے کہ جوانی

میں دھوبیوں کے سلسلے میں اُن سے کچھ لغزشیں ہوئی تھیں اور یہ بدجناوروں کی اولاد اب ان باتوں کا انتقام لے رہی ہے۔

دھوبی محلّے میں اُن کی تگ و تاز کے بارے میں مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ جوانی میں متی دادا دیکھنے دکھانے کی چیز تھے اور یہ کہ اُن کی آخری محبوبہ جمرت دھوبن سنہ ۶۵ میں ۷۰ سال کی ہو کر مری ہے۔

میں نے ڈبا کیمرے سے کھینچی ہوئی بادامی رنگ کی ایک بوسیدہ تصویر بھی دیکھی ہے جس میں اٹھارہ بیس برس کے متی دادا کان کی لَوتک پہنچی ہوئی لوہا چڑھی لاٹھی تھامے، تار اسی آنکھوں میں بہت سا سرمہ بھرے ایک زبردست پگڑ باندھے کیمرے کو گھورتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ متی دادا کی یہ تصویر مرحوم پھوپا ابّا کی کھینچی ہوئی ہے جنہوں نے شہر میں سب سے پہلے سنہ اٹھارہ سو کچھ میں بمبئی کی کسی پارسی فرم سے کیمرے کا وی پی پارسل منگوایا تھا۔ خاندان کے اسکینڈل باز بوڑھوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ متی دادا، پھوپا ابّا مرحوم اور اُن کے یاروں دوستوں کے لیے اغوا کی وارداتیں کیا کرتے تھے اور اربابِ نشاط سے رابطے قائم کراتے تھے۔ مگر یہ بڑی خباثت تھی، پھوپا ابّا کھرے پٹھان اور حافظِ قرآن تھے اور متی دادا تو تھے ہی یوسف زئی، ایسی گھٹیا باتیں اُن کے دائرۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں پھوپا ابّا نے انہیں ایک تپنچا خرید کر دیا تھا جسے چلانے کی نوبت تو شاید کبھی نہ آئی ہو مگر دھمکانے کے کام ضرور آتا تھا۔

میں نے اکثر متی دادا سے اس تپنچے کا ذکر سنا ہے۔ تقسیمِ ملک سے بہت پہلے کسی حرامی، اَزَل گر پھنتا بھان کے گھوڑے نے اسے چرا لیا اور دھوبیوں نے اڑا دیا کہ چرانے والے نے یہ تپنچا ٹین ڈبے بھُوسی ٹکڑے والے کو خستہ

گجک کے بدلے میں تلوادیا ہے۔ مٹی دادا پہنچے کے واقعے پر ہل کر رہ گئے تھے اور پولیس میں رپورٹ لکھانے چلے تھے مگر لوگوں نے سمجھایا کہ کیا غضب کرتے ہو، پولیس کو ہوا بھی نہ لگے، بلا لائسنس کا ہتھیار تھا اُلٹے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ مجبوری تھی۔ مٹی دادا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ بعد میں کئی برس تک اس انتظار میں رہے کہ بس مجھے پتا چل جائے کہ میرا تپنچا کس سالے کے گنے ہے۔ آنتیں نکال کے اس اَزَل گر پھتا بھان کے گھوڑے کے گلے میں پنا دُوں گا۔

آنتیں نکال کر گلے میں پہنا دینا ان کی پسندیدہ دھمکی تھی اور 'اجل گرفتہ' انہوں نے میرے چچا سے سنا تھا جو اس زمانے میں زور زور سے طلسم ہوشربا پڑھ کر ہم سب کو سنایا کرتے تھے۔

مٹی دادا کا خیال تھا کہ 'یہ یو، طلسم ہوشربا اور قصہ طوطا مینا اور انوار سہیلی وغیرہ ہیں یہ سب ٹھیک ہیں مگر انگریزی تعلیم جو ہے یہ آدمی کو 'نامرد' بنا دیتی ہے ـــــ یہ لفظ وہ بزدل کے معنوں میں استعمال کرتے تھے اور اکثر بڑے تاسف سے کہا کرتے تھے کہ غضب خدا کا جب سے ان پٹھان بچوں نے انگریزی پڑھنا شروع کی ہے اس خاندان کے لوگوں نے کوئی 'کتل' ہی نہیں کیا۔

ایک بار ابا نے یہ بات سن لی اور انہیں ایسی ڈانٹ پلائی کہ سب سے چار دن تک روٹھے رہے، کسی سے بات نہیں کی۔ آخر پانچویں دن مجھے اشارے سے بلا کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے کہ تیرے بادا علی گڑھ جا کے خراب ہوئے ہیں پہلے ایسے نہیں تھے، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم نے ایک قاعدے کی بات کہی اور وہ بگڑ گئے، بلا وجے۔

مگر یہ طے تھا کہ ابّا کو اور ہم سب بہن بھائیوں کو اُن سے جتنی محبّت ملتی تھی یا دوسروں کو اُس کی آدھی بھی نصیب نہیں تھی۔ ویسے مجموعی طور پر وہ پورے کُٹمب قبیلے کے عاشق تھے۔ مجھ سے کہتے تھے کہ میں تیرے کُٹمب قبیلے کے "ساکھ سجر" کا ماسٹر ہوں اور یہ کہ "ایسا چاروں کھونٹ ساکھ سَجَر" میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔

'ساکھ سَجَر' سے اُن کی مراد شجرۂ نسب ہوتی تھی مگر 'چاروں کھونٹ ساکھ سَجَر' کیا ہوتا ہے، یہ نہ میں نے کبھی پوچھا نہ انہوں نے کبھی بتایا۔

اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ میرے کُٹمب کی حد تک میں دادا علمِ اسم نویسی کے ماہر تھے۔

اس مرحوم خاندان میں بڑوں کا طریقِ کار یہ تھا کہ جونہی لڑکا اپنا پورا نام لکھنے کے قابل ہُوا اس کا دادا، تایا، باپ یا چچا اُسے شجرۂ نسب کی ایک وصلی تھما دیتے تھے کہ لو بیٹا، سنبھال سنبھال کے اس کی سو نقلیں تو بنا دو۔ ظاہر ہے کہ کلک اور گاڑھی سیاہ روشنائی سے لمبے لمبے کاغذوں پر یہ شاخ شجر بنائے جاتے تھے۔ پنسل، فاؤنٹن پین، فولادی نب وغیرہ سے بزرگوں کے نام لکھنا سخت بے ادبی بلکہ مُداخلت فی الدّین سمجھی جاتی تھی۔ انہیں درست طریقے سے بنانے میں مہینوں لگ جاتے تھے مگر یہ ایک طے شدہ طریقِ کار بلکہ پیدائشی جبر تھا جس سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ شاخ شجر مکمل ہو جاتے تو خاندان کا اُس دور کا پیٹری آرک، لمڈّوں کو بُلا کر اُن کی کارکردگی ملاحظہ کرتا اور تمام کلمے، الحمد شریف اور چاروں قُل سننے کے بعد پہلے اُس لڑکے کی مین لائن پھر برانچ لائنیں زبانی سنتا اور ایک روپیا کلدار عطا کرتا تھا۔ درمیان میں بھول جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے

کہ کئی مہینوں تک فلاں محمد خاں کے بیٹے فلاں محمد خاں اور ان کے بیٹے فلاں محمد خاں خوالوں تک میں تلواریں لیے ٹہلتے پھرتے تھے۔ انہیں بھول کون سکتا تھا۔

دوسرے پیڑی آرکوں کے برخلاف میرے دادا المڈوں کی بدخطی کو نظرانداز فرماتے تھے مگر لمڈے بندہ بشر ہوتے ہیں۔ اگر غلطی سے اِن محمد خاں کے بیٹے اُن محمد خاں کی بجائے وہ دوسرے محمد خاں لکھ دیا اور دادا کی نظر پڑ گئی تو سمجھو مارے گئے۔ انگلیوں پر کلک تقریباً توڑ دیے جاتے تھے کہ، سُوَر، میرے نگڑ سگڑ داد کو ولدالحرام بتا رہا ہے! اُس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس قدر خفا ہونے کی کیا بات ہے، ہم درست کیے لیتے ہیں ــــ مگر اب کچھ کچھ سمجھ میں آتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اُن سب کے یہاں یہ شدّت کس لیے تھی۔ شاید اپنی زاد بوم سے ہزار میل دُور اور سینکڑوں برس کے بُعد میں، یہ پشتون قبیلہ جو اپنی زبان بھی بُھول چکا تھا، کاغذوں پر اپنے نسب کے تحفّظ کی ہارتی ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔

اس لیے کہ لوگ کبھی کبھی شیخوں، مغلوں میں بھی شادیاں کر لیتے تھے اور بعضے تو اتنے بے ادب تھے کہ سیّدوں تک کی بیٹی لے آتے تھے، معاذاللہ۔ آلِ رسولؐ سے خدمتیں لینا اور کبھی کبھی سخت سُست کہہ دینا! ــــ اس بے ہودگی کا تصوّر ہی بدنوں میں لرزہ طاری کرنے کے لیے کافی تھا۔

تو دوسری اولادِ نرینہ کی طرح اس اذیّت سے، کہ جو ہمارے یہاں ختنہ ہی کی طرح لازمی تھی، مجھے بھی گزرنا پڑا۔ عالمگیر بادشاہ کے عہد سے میرے ہوش سنبھالنے تک آٹھ پیڑھیاں بُھگتانا بہ ظاہر کوئی مشکل کام نہیں تھا مگر وہ سپاہی لوگ تھے اور پھر اُن زمانوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا کوئی واضح تصوّر موجود نہیں تھا چنانچہ میں چیں بول گیا۔ مثلاً فلاں محمد خاں کے پانچ بیٹے،

ان پانچ بیٹوں کے مجموعی طور پر اٹھائیس اُنتیس بیٹے (جن میں بمشکل ایک دو لاولد) باقی ستائیس اٹھائیس کی اتنی اولادیں اور اُن کے اتنے اتنے نونہال... اور معلوم ہوتا تھا ابھی ہم چار پیڑھی ہی اُترے ہیں کہ ایک وضاحتی شجرہ اور تھما دیا گیا کہ بیٹا ذرا اب ماؤں کی طرف سے ان چاروں پیڑھیوں کا حساب تو کر لو۔

اور یہاں سے ایک نئی طرح کا عذاب مزید شروع ہوتا تھا اس لیے کہ کہیں خال خال انحراف کے سوا یہ خاندان آپس میں ہی شادیاں کرتا رہا تھا کیونکہ ہڈی اور خون کے تحفظ کا سوال تھا اور اس بات نے میرے لیے ایک عجیب صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ یعنی ایک رشتے سے جو صاحب میرے دادا یا نانا ہیں، وہ دوسرے حساب سے چچا اور تیسرے ذرا دُور کے رشتے سے ماموں ہوتے ہیں اور اس میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ـــ کئی ہزار کاغذوں پر اسی طرح لکھا ہے اور اب جو یہ صاحب میری پھوپی کی صاحبزادی سے شادی کرنے پر تُلے ہیں تو یہ میرے بہنوئی بن جائیں گے اور ذیلی شاخ شجر، جدول پانچ کے حساب سے دیکھو تو یہی صاحب میرے بھائی بنتے ہیں ہر چند کہ یہ رشتہ ذرا گھما کر ہے۔

اس عذاب سے گھبرا کر میں باقاعدہ رو پڑتا۔ تب ایسے میں مٹی دادا خدا کے بَروَقت فرشتوں کی طرح میری مدد کو آتے اور اسم نویسی کا مسئلہ پانی کر دیتے۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر گتھیاں سُلجھاتے اور ہمّت بندھاتے۔ خود اُن کے شجرۂ نسب کے بارے میں سوال کرنے کا ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔ یا آیا ہو گا تو دھوبیوں کی اُڑائی ہوئی افواہوں کے تناظر میں یہ سوچ کر کہ مٹی دادا اس بارے میں بہت حساس ہیں، ہم لڑکوں نے کبھی پوچھا نہیں

ہو گا۔ ایک بار کسی بزرگ خاتون نے خوش مزاجی سے پوچھ لیا کہ مجید تو سب کے شجرے یاد کیے بیٹھا ہے، خود اپنا شاخ شجر بھی یاد ہے تجھے؟ تو اتنی ہی خوش مزاجی سے بولے "ہاں بیا۔ کیوں نہیں۔ سنو، ثمیر ابنے ثمیر ابنے ثمبیر ابنے ابدل مزید کھاں ایسپ جیئ" اور ایک زبردست قہقہہ مار کر ہنسے۔ نادر شاہ دُرّانی کا یہ تاریخی لطیفہ بھی اُنہیں چچا نے ہی سُنایا تھا۔

ہم لڑکوں کے لیے اُن کی جو حیثیت تھی، اگر اُسے کسی ایک دو لفظی اصطلاح میں بیان کیا جا سکتا تو وہ اصطلاح تھی۔ "ماہر پشتو نبات" کی۔ وہ ہمارے لیے "پٹھان سا گا" کے عالم تھے مثلاً یہ کہ پشتو زبان جو دنیا کی پرشکوہ زبانوں میں سے ایک ہے، کچھ اس طرح بولی جاتی ہے کہ دغا دار وڑا دا پستہ دا بادام رروڑا دا ہینگ" اور یہ ہمیں بہت شاندار لگتا تھا کہ ہمارے پرکھ ایسی زبردست زبان بولتے ہوئے کفار کے علاقوں میں دَر آئے تھے اور انہوں نے سیاہ فام بھیلوں، کورکوؤں اور گونڈوں کے درمیان کھڑے ہو کر اعلائے کلمۃ اللہ کیا تھا اور یہ زبان بولی تھی۔ کیسا رعب پڑتا ہو گا مقامی آبادیوں پر!

اپنے ہم عمر کُٹمب قبیلے والوں میں شاید میں سب سے زیادہ پُر تخیل واقع ہُوا تھا۔ آنکھیں پھاڑے منہ کھولے متی دادا کا بولا ہُوا ایک ایک لفظ پیتا رہتا۔ اور جب میری عمر کے دوسرے لڑکے پتنگیں اُڑانے اور ہاکیاں کھیلنے میں لگے ہوتے میں باڑے کی کوٹھریوں والی چھت پر چڑھ جاتا اور اپنے قبیلے کے وطن تیراہ سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دُور، اپنے پشتون اَجداد سے ڈھائی تین سو سال پَرے، ٹین کی نالی دار چھت پر لیٹا ہُوا قبائلی جنگیں لڑا کرتا یا بقول متی دادا دَرّۂ خیبر میں "ڈنڈم ڈنڈا اور تلوارم تلوارا" کیا کرتا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں میرا پسندیدہ کھیل یہ ہوتا تھا کہ میں کاٹھ کباڑ

والے تاریک کمروں میں گھس جاتا، یا تل گھروں میں اُتر جاتا یا دھاوؤں پر چڑھ جاتا اور کھیتی باڑی کے آلات میں دبے ہوئے زنگ خوردہ آدھے پون ہتھیاروں میں سے اپنے مطلب کی کوئی چیز نکال کر اُسے اپنے طور پر صیقل کرتا کبھی کوئی پوری تلوار، کٹار بھی مل جاتی جو زنگ سے نڈھال ہو کر ہل یا ہیسیے یا پاسے کی طرح بوجھل اور بے ڈول ہو گئی ہوتی تو اُسے دیکھ کر مجھے عجیب سا خیال آتا اور میں سوچتا کہ یہ تلوار جو اَب ہل یا ہیسیے یا پاسے کی شکل ہو گئی ہے یہ شاید ہمارا سپاہی پیشہ خاندان ہے اور اسے زمین پر پڑے پڑے ایک 'عدم استعمال'، یا 'غلط استعمال' نے کسان بنا دیا ہے۔ سو میں اپنے زنگ خوردہ سپاہی کو بحال کرنے کی کوشش میں بہن بھائیوں کے روبرو ناٹک کیا کرتا تھا۔ پردادا کی کامدار مخمل کی پھٹی ہوئی فرغل پہن کر، کمر سے آدھی پون تلوار باندھ کر میں پشتو مکالمات میں (جو ظاہر ہے متی دادا کی ایجاد ہوتے تھے) کفار کو للکارا کرتا، پشتو رجز پڑھا کرتا۔ متی دادا کو یہ ناٹک اور ہتھیاروں کی یہ بحالی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ گھنٹوں ہم لوگوں کے ساتھ اس کھیل میں شریک رہتے کیونکہ اُن کا بیان تھا کہ وہ ہتھیاروں کے درمیان پیدا ہوئے تھے۔ ان کو ہر قسم کے ہتھیاروں سے عشق تھا۔

۴۶ - ۴۷ کے پُر آشوب زمانے میں پڑوس کی غیر مسلم ریاست سے مسلمان ہجرت کر کے ہمارے شہر آ رہے تھے، کیونکہ ہمارا شہر مسلمان اکثریت کا شہر تھا، شاید اب بھی ہو گا اور یہ پٹھانوں کی بسائی ہوئی ریاست تھی۔ متی دادا ایک روز ریلوے اسٹیشن سے گھیر گھار کے صیقل گروں، اسلحہ سازوں کا ایک خاندان لے آئے اور انہیں باڑے میں بٹھا کر ابا کی تلاش میں اسکول پہنچ گئے۔ پتا نہیں کس طرح ابا کو قائل کر لیا کہ بے چارے بے آسرا لوگ ہیں۔ جہاں چار کنبوں

کوباڑے کی کوٹھریوں میں پناہ دی ہے تو میاں ان کے لیے بھی جگہ نکالیے۔
پھر منی دادا نے بڑی کوشش اور سیاست سے اسلحہ سازوں صیقل گروں کے لیے ایک کوٹھری خالی کرائی، لکڑی کے کھوکھے لالا کر تختے نکالے اور جگہ کر، باڑے میں ایک چھوٹا سا کمپاؤنڈ بنا دیا۔ اسلحہ سازوں، صیقل گروں نے دوسرے ہی دن گڑھا کھود کر دھونکنی نصب کر دی اور کھٹا کھٹ چھریاں تلواریں بنانی شروع کر دیں۔ پہلا زنبیہ منی دادا کے لئے تخلیق ہوا جس کے نیام پر اماں کی پرانی مخملیں صدری سے حاصل کیا ہوا کپڑا مڑھا گیا اور مرحوم تمنچے کے بعد منی دادا ایک اصل نسل زنبیے کے مالک بن گئے۔ تمنچے کی گمشدگی اور زنبیے کے حصول کے درمیان کی عذاب ناک مدت کے بارے میں پہلی بار منی دادا تقریباً مسکرا کر کہنے لگے، "یہ جو تمنچا گایب ہوا ہے تو اس میں بھی مالک کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوئے گی۔ کیا پتا ہم کسی بھان کے گھوڑے کے پیٹ میں جھونک دیتا، بلاوجہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ پلس کچیری ہوتی پھرتی۔" کسی نے خدشہ ظاہر کیا کہ منی دادا تمنچا لے لینے اور زنبیہ دے دینے میں مالک کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ اب آپ کسی گھوڑے کے پیٹ میں زنبیہ اتار دیں گے۔ تو زور سے ہنسے اور زنبیے کے مخملیں نیام کو تھپکنے لگے، "بے کیا کھوجی سمجھ لیا ہے۔"
رتن ناتھ سرشار کے خوجی سے میرے چچا نے اور سروانٹے کے ڈون کیہوٹے سے میں نے متعارف کرایا تھا۔ مگر کیہوٹے اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہتے تھے "گورے سب ـــ تیا ہوتے ہیں۔"
یہی زمانہ تھا کہ ریاستی حکومت نے آتشیں اسلحہ اور چند انچ سے زیادہ پھل کے ہر دھار دار آلے کے لائسنسوں کی سختی سے پڑتال شروع کر دی۔ نئے لائسنس جاری ہو رہے تھے مگر بڑی سفارشوں کے بعد اور لائسنس

کی سالانہ فیس بھی ہوتی تھی جو بڑی وجیادتی، کی بات تھی مگر پہلا مسئلہ لائسنس کا حصول تھا۔ منی دادا نے اماں کی خوشامد کر کرا کے ماموں سے سفارش کروائی۔ وہ پولیس میں کوئی توپ افسر تھے۔ اور منی دادا کا کام بن گیا۔ زنبیے کا بارہ آنے سالانہ کا لائسنس جاری ہو گیا۔ منی دادا کو یہ بارہ آنے ہمیشہ کھلتے رہے مگر اُنھیں یہ اطمینان ہو گیا کہ اُن کا زنبیہ "اب کوئی بھان کی گھوڑی گورمنٹ" بھی نہیں چھین سکتی، دوسروں کا ذکر ہی کیا۔ اماں نے اور ماموں نے سفارش گزارنے سے پہلے منی دادا سے تقریباً حلف اٹھوا لیا تھا کہ وہ کسی کو اس زنبیے سے دھمکائیں گے نہیں۔ "ناہیں میاں، جیسی چاہے کسم لے لو، ہیں کسی اُزل گربھتا بھان کے ... "

منی دادا سال میں ایک بار خود اپنا لائسنس اور میرے ابا، تایاؤں، چچاؤں، پھوپاؤں، خالوؤں کے اور میری اماں کے نام کے بندوقوں، رائفلوں، تیغوں، تلواروں، خنجروں، کٹاروں، کرچوں کے لائسنس اکٹھے کرتے اور فیس بھرنے کے لیے لائن لگاتے۔ واپس آتے تو مردانہ ڈیوڑھی سے ہی بڑبڑانا شروع کر دیتے کہ غضب خدا کا، ایک زمانہ وہ دیکھا سُنا تھا کہ گدی نشین تو نہیں تھے مگر فلاں محمد خاں کے محل پے پانچ پانچ توپیں چڑھی رہتی تھیں" مزال تھی کوئی اُزل گربھتا بھان کا گھوڑا انجر بھی ڈال کے دیکھ سکتا" — اور فلاں محمد خاں بھی اگرچہ گدی نشین نہیں تھے مگر" ون کے کنے سو لھے سو تروارین تھیں"۔ وہ وہ سروہیاں، تیغے، کھانڈے، کرچیں، زنبیے، کٹاریں، گھکھریاں، پیش قبض تھے کہ رہے نام مالک کا۔

ابا کہتے تھے، مجید کو تو ریاست کے اسلحہ خانے کا داروغہ ہونا چاہیے تھا۔ ہتھیار دیکھ دیکھ کے اس کا خون بڑھتا رہتا۔ پھر حکومت نے حکم جاری کیا

کہ تمام ہتھیار سرکاری مال خانے میں جمع کرا دیے جائیں۔ مٹی دادا نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ یہ خبر سُنی۔ دو روز تک مغلظات بکتے رہے۔ غصّہ ذرا ٹھنڈا ہُوا تو میرے دو تین بزرگوں کو اپنا ہمخیال کیا اور ابا کو مشورہ دیا کہ لائسنس والے ہتھیار بے شک جمع کرا دیے جائیں مگر کونوں کھدروں، تل گھروں میں، دھادوں پر اور دیواروں میں پُرکھوں کی جو امانتیں محفوظ ہیں اُن کا کہیں کوئی اندراج نہیں ہے سو اُن کو صیقل کرا کے تیار رکھا جائے۔ زمانہ خراب ہے۔ اور پٹھان بچے تو اچھے زمانے میں بھی تیار رہتے ہیں۔

ابا علی گیریَن تھے، اصول پرست آدمی تھے، انہیں حکومت کے واضح احکام کی خلاف ورزی کسی صورت منظور نہیں تھی۔ پھر اُن کا کہنا تھا کہ سو پچاس برس کے دفن کیے ہُوئے ہتھیار اب کھاد بن چکے ہوں گے پھر اس تردّد سے جا سے کیا حاصل؟ اس لیے اس معاملے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ مٹی دادا بظاہر مایوس ہو کر بیٹھ رہے مگر ہم لڑکے دیکھ رہے تھے کہ اُن کے گرد و پیش اور ہمارے دو ہزار دالانوں، دھادوں، تل گھروں، زینوں میں ایک پراسرار سرگرمی جاری ہے جس کا ابا کو کوئی پتا نہیں۔

لائسنس دار اسلحہ جمع کر دیے گئے۔ دو تانگوں میں کٹمب قبیلے کے دو چار بڑے اور مٹی دادا ہتھیار لاد کر پولیس کے مال خانے پہنچے اور رسیدیں کٹوا کر خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔

میں اسکول سے آیا تو دیکھا کہ مٹی دادا ڈیوڑھی میں دیوار سے ٹیک لگائے سر نہوڑائے اکڑوں بیٹھے ہیں۔ یوں لگتا تھا اپنے کسی خون کے رشتے کو مٹی کے سپرد کر آئے ہیں۔ دُکھ اتنا گہرا اُتر گیا تھا کہ آج مغلظات بھی نہیں سنا رہے تھے۔ پھر جو تین چار دن بعد میرے ایک تایا کے ہتھیار جمع کرانے

مال خانے گئے تو متی دادا لوٹ کر نہیں آئے۔

خبر آئی کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے، کوتوالی خاص کے لاک اپ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور مغلظات سے شغل ہے۔ ہاں ہاں کر کے تقریباً پورا قبیلہ دوڑ پڑا۔ متی دادا ویسے تو شاید ملازم تھے مگر میرزائی خیلوں کی ڈیوڑھیوں کے پروردہ تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ دوسرے قبیلے کے ہی سہی، پٹھان تھے ــــ وردیوں کے نرغے میں انہیں اکیلا کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔

اماں تانگے میں بیٹھ ترنت اپنے پولیس بھیا کے یہاں پہنچیں اور میز پر سروتا مار مار کر بھائی کو حکم دے دیا کہ ابھی اسی وقت متی دادا کو گھر آ جانا چاہیئے، میاں ــــ آج ہمارے پشتینی اہلکار کو ــــ ایک بوڑھے کو بند کر دیا ہے تم نے تو کل ہمارے بچوں کو باندھ لے جاؤ گے۔ پرکھوں نے کیا اسی لیے اپنی تلواروں سے جنگل کاٹ کاٹ کے یہ ریاست بسائی تھی۔ آئیں؟ اس روز میری اماں کا جلال دیدنی تھا۔ بولتی ہی چلی گئیں۔ غالب کے شاگرد نواب یار محمد خاں شوکت کی پوتی تھیں۔ ایک جید نوابزادے کی فکر مندی، ایک توانا شاعر کی طلاقتِ لسانی اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔

ماموں کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، "مگر منجھلی آپا بتا تو چلے کہ اسے کیوں بند کیا گیا ہے ــــ سنیئے تو ــــ میں بھیجتا ہوں کسی کو ــــ آپ اندر تو چلیے۔ کھانا تو کھا لیجیے۔" مگر اماں چٹان کی طرح اُن کی مردانہ بیٹھک میں جمی رہیں اور جلال کے عالم میں بیٹھی چھالیا کترتی رہیں۔ ماموں کا پورا گھر ایک ایک بسکٹ اور ایک ایک پیالی چائے پر صبر کیے انہیں گھیرے بیٹھا رہا۔ ماموں کو وردی پہن کر خود جانا پڑا۔

دو گھنٹے بعد متی دادا ہماری ڈیوڑھی میں بیٹھے تھے اور کوئی دو درجن

میرزائی خیلوں کو اپنی روداد سنا رہے تھے۔

"ابل گرفتہ" اور وہ دوسری بات ہٹا کر میں جو سمجھ سکا، وہ یہ تھا کہ جب وہ تایا کے ہتھیار جمع کرانے مال خانے پہنچے تو حوالدار سکھیا رام جو ذات کا تیلی ہے اور وردی پہننے کے باوجود کسی طرف سے سپاہی نظر نہیں آتا، اس دن مال خانے کا انچارج تھا۔ منی دادا اور سکھیا رام کی پہلی مشترکہ بدقسمتی یہی تھی کہ ڈیوٹی پر سکھیا رام تھا۔ اگر بیلا سنگھ ٹھاکر یا گلاب خاں حوالدار ڈیوٹی پر ہوتے تو وہ کچھ نہ ہوتا جو ہُوا۔

پہلے تو سکھیا نے ہنس کر ان کی طرف دیکھا۔ دوسری واضح حرمزدگیاں یہ کیں کہ انہیں بڑے میاں کہہ کر مخاطب کیا اور چپراسی کے اسٹول پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ منی دادا ایک طرف کھڑے اُسے گھورتے رہے۔ آتش فشاں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اُس کی آخری اور نا قابلِ معافی بدمعاشی جس سے آتش فشاں کا ڈھکنا ایک 'بوم' کے ساتھ اُڑ گیا، یہ تھی کہ اُس تیلی کے بچے نے ہمارے ہتھیاروں میں سے ایک ہتھیار اُٹھا لیا اور بے نیازی سے بیڑی پیتے ہوئے اُس سے اپنی پنسل چھیلنے لگا۔

یہ نواب غوث محمّد خاں فتح جنگ بہادر کا پیش قبض تھا جس کا قبضہ سنگِ یَشب کا تھا جس پر سنگ تراش نے پھول پتّیوں کے نقش کچھ اس طرح اُبھارے تھے کہ لگتا تھا موم سے ڈھال کر نکالے گئے ہیں، پیش قبض کے ایک چوتھائی پھل پر سونے کے پانی سے خُلد آشیانی بُزرگ کا نام نامی درج تھا اور فارسی زبان میں خبر دی گئی تھی کہ یہ ہتھیار ایک ایرانی کاریگر نے بطورِ خاص نواب بہادر کے لیے تخلیق کیا ہے کہ جو زمین پر کھڑے ہو کر رو برو شیر کا شکار کیا کرتے ہیں۔

سو پہلی بات تو یہ کہ سُکھیارام ذات کا تیلی تھا اور آخری بات یہ کہ بیڑی پیتے ہوئے نواب غوث بہادر جنت مکانی کے پیش قبض سے پنسل چھیل رہا تھا۔

منّی دادا نے 'ازل گرپھتا' یا 'بھان کے' کہہ کر جو ایک زنّاٹے کا تھپّڑ مارا تو حوالدار سُکھیا کی بیڑی اور پنسل دُور جا پڑی پھر اُنھوں نے اس تیلی کے پوتے کو اطلاع دی کہ یہ شیر بچوں کی میراث ہے — تیری ترکاری کاٹنے والی چھُری نہیں اور یہ تیرے ہاتھ لگنے سے تو نجس ہو ہی چکی تھی مگر میں نے صبر کیا اور اب جو تُو بھان کے گھوڑے اس سے پنسل چھیلتا ہے، اب تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا وغیرہ۔

ظاہر ہے اس کے بعد منّی دادا کو کوتوالی خاص کے لاک اَپ میں منتقل کر دیا گیا۔

کوتوالی انچارج بڑے چکّر میں تھا۔ تین فیتوں والے ایک چھوٹے موٹے پولیس افسر کو جو سرکاری وردی میں ڈیوٹی پر تھا ایک سویلین نے زدوکوب کیا تھا اور سرکاری فرائض کی بجاآوری میں مزاحم ہُوا تھا۔

مگر ریاست ابھی یونین میں ضم نہیں ہُوئی تھی۔

ایک پٹھان نواب ابھی ماہی مراتب کے سائے میں ریاستی گدّی پر بیٹھا مقدور بھر فرمانروائی کرتا تھا اور ایک ہزار سے زائد مسجدوں کے ایکہزار سے زائد منبروں سے ابھی اُس کے نام کا خطبہ پڑھا جا رہا تھا کہ خَلَّدَ اللّٰہُ مُلکَہٗ وَسَلطَنَتَہٗ — ہرچند کہ ریاستی پرچم کا مستول ہاتھوں سے پھسلا جاتا تھا اور نئی دلّی میں بات چل پڑی تھی کہ ریاست ضم کر دی جائے گی۔

تو نواب کے خوشحال، نیم خوشحال، تعلیم یافتہ، نیم تعلیم یافتہ — اور

مہذّب، نیم مہذّب مگر با اثر کُنبہ قبیلے کے معزّزین اور ذرا کم معزّز کئی سو پٹھان کوتوالی خاص کو گھیرے کھڑے تھے کہ اتنے میں ماموں پہنچ گئے۔ انہوں نے علیگڑھ سے نفسیات میں فاضل کی سند خواہ مخواہ تو نہیں لی تھی۔ دس بیس منٹ میں اپنے توپ عہدے کی دھونس دیے بغیر بڑے پیار سے اپنے اُس ماتحت افسر کو قائل کر لیا کہ یہ غنڈا گردی اور فوجداری سے زیادہ تاریخ کی بازی ہارتے ہوئے ایک غیرت مند قبیلے کی جھلاہٹ اور مجروح اَنا کا مسئلہ ہے۔ کوتوالی انچارج ذات کا چوہان راجپوت تھا اور تلوار باندھنے والے ہارتے ہوئے ہاتھوں کی تکلیف کو شاید سمجھتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بیوقوف غیر سپاہی ہیڈ کانسٹیبل کی وجہ سے اپنے افسرانِ بالا کے لیے مزید مسائل پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

حوالدار سُکھیا رام کو جواب طلبی کا پروانہ ملا کہ ہرگاہ ہمارے علم میں آیا ہے کہ تم نے ریاست سے متعلق نہایت بیش قیمت نادر اور تاریخی اہمیت کے حامل ایک ہتھیار کو کہ جو تمہاری تحویل میں وغیرہ وغیرہ۔ سُکھیا رام کو لائن حاضر کر دیا گیا۔

ابّا نے منّی دادا کو آرام کرنے کے لیے، زمینوں پر بھیجد یا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ ہر کس و ناکس کو حوالدار سُکھیا، سابق انچارج اسٹیٹ مال خانہ کے زوال کی داستان سناتے پھرتے تھے۔

مگر کسے معلوم تھا کہ منّی دادا کا تقریباً زوال بھی ہم لڑکوں کو دیکھنا پڑے گا۔ ایک بات پر ابّا اُن سے سخت ناراض ہوئے، باڑے کی ایک کوٹھری خالی کرائی گئی اور منّی دادا کو پہلی بار ہماری ڈیوڑھی سے کچھ دُور چھاؤنی چھانا پڑی۔

ہوا یوں کہ دادا کے انتقال کے بعد شاید پہلی بار ہماری ایک بہن قبیلے سے باہر بیاہی گئی۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر سخت سویلین تھا کہ اُس کا تعلق

کسی مارنے دھاڑنے والے قبیلے سے نہیں تھا۔ شادی کے بعد، ہمارے یہاں کے دستور کے مطابق داماد کو لے جایا گیا کہ وہ متی دادا کو سلام کرے اور متی دادا اُسے دو روپے سلامی کے دیں۔ ظاہر ہے، وہ اس کے بزرگ تھے۔ کوئی بوڑھا ادھیڑ اُس وقت موجود نہیں تھا اس لیے ہم لڑکوں کو مقرر کیا گیا کہ داماد کو لے جا کر رسم پوری کرائیں۔ متی دادا علیل تھے، نئے داماد کو دیکھ کر مسکرائے، جیوٹ کر کے اُٹھ بیٹھے۔ ہم نے دائیں بائیں تکیے لگا دیے۔ سلام لے کر اُنھوں نے داماد کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سلامی کے دو روپے عطا کیے اور پھر 'پشتو نیات' کی بساط پھیلا دی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے تک نیا داماد منہ کھولے متی دادا کے انکشافات سُنتا رہا۔ 'ساکھ شجر' پر ایک سیر حاصل تبصرے کے بعد متی دادا نے داماد کو بتایا کہ یہ میرزائی خیل بڑے جیوٹ والے کُٹمب ہیں، خونخوار اتنے کہ 'مزال' ہے کوئی اُن کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لے اور یہ کہ جو چالیس بیالیس گھر اس محلّے میں ایک ساتھ چلے گئے ہیں، یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں، ہر گھر نے دوسرے گھر میں ایک کھڑکی اتنی بڑی نکال رکھی ہے کہ ایک سالم آدمی مع تلوار یا 'رفل' کے گزر سکتا ہے۔ اگر محلّے کے اس سرے پر میرزائی خیلوں کے کسی گھر پر حملہ ہو تو 'دس منٹی' میں اِس سرے سے اُس سرے تک سَو سوا سو مسلح پٹھان بچے صورتِ حال پر قابو پانے اور حملہ آور کو تہس نہس کرنے کے لیے جمع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سنہ فلاں میں فلاں محمّد خاں ایک ذرا سی بات پر نائب کوتوال کو مع اُس کے گھوڑے کے قتل کر دینے کے بعد کھڑکیوں کھڑکیوں، گھروں گھروں گزرتے ہوئے صاف نکل گئے تھے، تو یہ فائدہ ہے ان مربوط مکانوں کا۔ پھر اس طرح عزیز پیاروں میں آپس میں

میل محبّت بھی رہتی ہے۔ اس کی مثال ممی دادا نے یوں دی کہ یہ جو اپنے پچّو میاں بیٹھے ہیں تو ان کے فلانے پر دادے نے انھی کے فلانے پر نانے کو صرف اتنی سی بات پر قتل کر دیا تھا کہ دونوں ایک جگہ ولیمہ کھانے گئے تھے۔ پَردادے پہلے سے موجود تھے کہ پرنانے آئے۔ دونوں میں جائیداد پر معمولی سا مقدمہ چل رہا تھا (ویسے کوئی خاص بات نہیں تھی ان لوگوں میں نالشیں، فوجداریاں ہوتی ہی رہتی تھیں، ڈنڈم ڈنڈا، تلوارم تلوارا بھی چلتی رہتی تھی، کس لیے کہ شیر بچے ہیں آخر کچھ نہ کچھ تو کریں گے ہی) تو ان کے پرنانے جب ولیمے کی فرشی نشست پر جانے کے لیے پاپوشیں اتارنے لگے تو ان کی ایک پاپوش اِن کے اُس پردادے کی پاپوش پر چڑھ گئی کہ جو پہلے سے موجود تھا اور نووارد پُرکھ کی حرکات و سکنات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ پاپوش کا پاپوش پر چڑھنا تھا کہ ان کا پہلے والا پرکھ جھٹ اُٹھا اور خبردار کہہ کر تلوار کا جو بھرپور ہاتھ مارا ہے تو دوسرے پُرکھ کی گردن بھٹّا سی دُور جا پڑی۔

داماد کے چہرے سے پسینہ بہہ بہہ کر شادی کی نئی شیروانی کے کالر میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دو تین بار پانی پی چکا تھا اور حد درجہ بے چین تھا۔ دیر بھی بہت ہو گئی تھی، ہم اُسے زنانے میں لے آئے۔

دوسرے دن طوفان پھٹ پڑا۔ ممی دادا بیمار تھے، اُن سے تو ابا نے کچھ نہیں کہا، اماں کے سامنے گرجتے برستے رہے کہ کیا مجید کا بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ داماد کو اس قدر دہلا دیا کہ وہ گھر جا کر گُم صُم لیٹ گیا۔ لڑکی سے پوچھتا تھا کہ کیا یہ سب باتیں صحیح ہیں؟ اور کیا تم قاتلوں خونخواروں کی اولاد ہو؟ کیا تمہارے یہاں بات بات پر تلوارم تلوارا ہوتی ہے؟ پوچھ رہا تھا، تمہارے گھر میں اب کتنی تلواریں ہیں؟ اور کیا سب لوگ اب بھی ویسے

کی دعوتوں میں تلواریں باندھ کر جاتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کو قتل کرنے میں آسانی ہو؟ حد ہوگئی، آخر یہ گڑے مُردے اکھاڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہر گھرانے میں کچھ نہ کچھ پاگل پن ہوتا ہی رہتا ہے۔ تو کیا اُس کو اس طرح مشتہر کیا جاتا ہے؟ لاحول ولا قوۃ۔

ہفتے بھر بعد باڑے میں ایک کوٹھری تیار کر دی گئی اور متی دادا کو وہاں فروکش ہونا پڑا۔

ڈیوڑھی سے دوران کی بیماری نے شدّت اختیار کر لی۔ ویسے تو اُنہیں ہم سب گھیرے رہتے تھے مگر وہاں اُن کا دل نہیں لگتا تھا۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ داماد والے معاملے میں منجھلے میاں خفا ہو گئے ہیں اور اسی لیے اُن کو ڈیوڑھی سے دور کر دیا گیا ہے۔ بڑی حسرت ناکی باڑے پر اور اس کے گرد و پیش چھائی ہوئی تھی۔ ایک روز کہنے لگے "اب مزید کھاں ایسپ جبیٔ جمین کا بوجھا بنتا جا رہا ہے۔ چل چلاؤ کا ٹیم ہے۔" وہ ابّا کو بُلوا کر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے جا عرض کیا کہ متی دادا بہت بیمار ہیں، آ کر دیکھ لیجیے۔ ابّا آئے تو جیسے متی دادا کھل اُٹھے۔ حکیموں ویدوں کے "نمکسوں" پر باتیں کرتے رہے —— 'ازل گرِ پھنا' اور 'بھان کے'، وغیرہ بھی شروع ہو گیا۔ پھر اچانک بڑی چمکدار آواز میں، جیسے ابّا کو کوئی لطیفہ سنا رہے ہوں، کہنے لگے کہ منجلے میاں، وہ داماد والے معاملے میں آپ خفا ہو گئے، شاید اسی لیے مجھے یہاں پھنکوا دیا۔ ابّا نے کچھ ہُوں ہاں کر دی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ متی دادا کی بیماری سے، اُن کی حسرت ناکی، اُن کے لطیفہ سنانے کے انداز سے، جو ظاہر ہے ابّا کو راضی کرنے کی بڑی رقت انگیز کوشش تھی، وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ متی دادا کہنے لگے "میاں، ویسے تو آپ ماسے اَللہ بال بچے والے ہو، برے میرے آگو کے بچے

ہو۔ میری مُعلے تیں آپ نہیں سَمَج سکتے ۔ یہ یو کہتے ہیں ناکہ داگڑ پاکُستَن دا رُوجے
اَوّل ، تو میں نے صائب جاوے کو کھبردار کردیا ہے کہ ہاں کھبردار پٹھانوں سے
مالا ہے ۔۔۔ اب صاحِب جاوے جیادہ کُچ چِبں پٹا کھ نہیں کریں گے انساآلآ"۔
اباّ نے اسی دن مِٹی دادا کی ڈیوڑھی میں بحالی کے احکام صادر کردیے۔
تو جیسے سُوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ مِٹی دادا کی حالت بہتر ہونے لگی مگر وہ بہت
بوڑھے ہو گئے تھے زیادہ دن چلتے نظر نہیں آتے تھے۔ امّاں نے ان کی محبوبہ
جُمرت کو اُن کی دیکھ بھال کی اجازت دے دی۔ وہ آکر منہ دھلاتی ، کپڑے
بدلواتی ، اپنے ہاتھ سے دلیا کِھلاتی ، پرچ میں انڈیل انڈیل کر چائے پلاتی۔
مہینوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اباّ نے ڈاکٹروں کو دکھایا ، کئی طرح کے علاج بدلوائے
مگر مِٹی دادا پھر سنبھل نہ سکے گرتے ہی چلے گئے۔ اُن کا آدھا بستر سمیٹ دیا
گیا۔ چارپائی کی بان دو طرف سے کھینچ کر درمیان میں ایک خلا بنا دیا گیا
اور اُس کے نیچے تام چینی کا تسلا رکھ دیا گیا۔ حوائجِ ضروریہ کے لیے وہ اب
بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ جُمرت نے اُن کی صفائی ستھرائی
کی سب ذمہ داری سنبھال لی تھی مگر وہ کنبے دار عورت تھی، رات میں نہیں
رُک سکتی تھی۔ راتوں میں ، میں دیکھتا کہ اباّ گرم پانی کے لوٹے لیے کئی کئی بار
ڈیوڑھی کی طرف جاتے اور کئی بار کمزور سی آواز میں مِٹی دادا کے احتجاج کرنے
اور رونے کی آواز آتی۔ وہ اباّ سے خدمتیں نہیں لینا چاہتے تھے۔ امّاں نے اُن
کی دیکھ بھال کے لیے اپنے میکے سے کوئی ملازم بلوانے کو کہا تو مِٹی دادا نے
سختی سے منع کر دیا۔ میرے اباّ اُن کے سامنے کے بچے تھے ، بیٹوں کی طرح
تھے۔ تو بیٹوں کی بات تو ٹھیک ہے " میں گیروں کے سامنے ڈھکا کھلا
نہیں ہو سکتا۔ وِس سے تو اچھا ہے مجھے اسپتال پہنچا دیو بیا" مگر سب

جانتے تھے، وہ اسپتال میں دو گھنٹے بھی نہیں نکال سکیں گے۔ ختم ہو جائیں گے۔ انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ میں اس گھر میں مرنا چاہتا ہوں۔ وہ کئی کئی گھنٹے غشی کی حالت میں پڑے رہتے۔ دِن میں جمرت اور ہم لڑکے، رات میں ابا، امرکان بھر اُن کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے تھے مگر سب تھک چکے تھے۔

اور اس تھکن اور بوکھلاہٹ میں جمرت کو متی دادا کی ایک واضح ہدایت کا خیال نہیں رہا۔ وہ غشی کی حالت میں تھے کہ میں نے انہیں "ڈھکا کھُلا" دیکھ لیا — میں نے دیکھا کہ اُن کی مسلمانیاں نہیں ہوئی تھیں۔

اپنے چھوٹے سے ذہن میں بہت سے سوالات لیے میں خاموشی کے ساتھ ڈیوڑھی سے چلا آیا۔ اس نئی اور عجیب بات کی سنسناہٹ مجھے چین نہیں لینے دینی تھی۔ چھت پر گیا۔ باڑے میں ٹہلا۔ اماں کے پاس بیٹھا بہت دیر آنڈے بانڈے گھومتا پھرا۔ مگر متی دادا بہت بیمار تھے اور وہ ہم سب سے بہت محبت کرتے تھے۔ میں پھر ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔

میں نے سنا اُن کے ٹھہر ٹھہر کر غصہ کرنے اور رونے کی کمزور سی آواز آ رہی تھی۔ جمرت نے شاید انہیں بتا دیا تھا کہ کیا غضب ہو گیا ہے۔

"بھان کی گھوڑی مرتے مرتے کالک لگوا دی تو نے ...... لڑکے کیا سوچیں گے۔" پھر اُن کے رونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی "ٹھی ی ی ک ہے تیلی کا لمڈا پٹھانوں کے پالے سے پٹھان تو نہیں بن جاتا۔"

میں اب ڈیوڑھی میں نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر باڑے کی طرف نکل گیا۔

تو کیا متی دادا ساری زندگی ہم سے جھوٹ بولتے رہے ؟ تو کیا محلے کے دھوبی ٹھیک کہتے تھے ؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے شکر کا نام لے کر کسی نے مجھے مٹھی بھر ریت پکڑا دی ہے مگر یہ بات میں کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتا تھا۔

وہ چار دن اور زندہ رہے مگر یہ چار دن غشی اور بیداری کی بھول بھلیاں تھے۔

اُن کے انتقال کے کئی مہینے بعد وہ ایک سوال جو اُس سنسناہٹوں والے دن سے برابر میرے ساتھ تھا، مجھے بے چین کیسے ہوئے تھا، میں نے یکبارگی ابّا کے سامنے رکھ دیا۔ ابّا مسجد جانے کے لیے ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے کہ متّی دادا کی کوٹھری کے سامنے مجھے خاموش کھڑے دیکھ کر رُک گئے۔ آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، بولے "کیا بات ہے؟"

میں نے بات بتا دی۔

وہ بہت دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے، "وہ کوئی بھی تھے تمہیں بس ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے محبّت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ تم اپنے دادوں پردادوں کی طرح عزّت کے ساتھ جینا سیکھ جاؤ — سمجھے؟ جاؤ اب کھیلو۔"

پھر وہ جاتے جاتے غصّے سے پلٹ پڑے، "اور سنو، کون خبیث کہتا ہے وہ مسلمان نہیں تھے! کون کہتا ہے پٹھان نہیں تھے!"

چاکر

خاکستری رنگ کے گاڑھے کا پیوند لگا لمبا کرتا پسینے سے بھیگ کر بدن سے چپک گیا تھا۔ گھنٹوں کی مشقّت کے بعد کھردری ہتھیلیوں کی مضبوط گرفت میں پھاوڑے کا دستہ پسینے سے پھسلنے لگا تو کرتے کی آستینوں سے ہتھیلیاں پونچھیں، رکوع کے انداز میں جھکے جھکے پھاوڑا اچھالتے رہنے سے کمر کی ہڈّیاں اور پٹھّے اکڑ گئے تھے تو جوان بازوؤں کو میناروں کی طرح بلند کیا اور پورے قامت سے تن کر انگڑائی لی۔ دھول میں اَٹے اپنے پیروں کے درمیان زمین پر نظریں گاڑے سر جھکائے لمحے بھر کو ساکت کھڑے رہے۔ پھر دونوں گھٹنے خم کیے اور دو زانو کھیت کی مینڈ پر بیٹھ گئے۔ مشقّت سے سنولاتے ہوئے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں بھربھری مٹی میں گڑا دیں پھر آہستہ آہستہ کہنے لگے:

"مٹّی، او مٹّی۔ اگر یہ امرِ الٰہی ہے کہ میں اور میرے ہمسائے اپنے اس ختم نہ ہونے والے روزے میں ہی اپنے خالق سے جا ملیں تو بے شک ہم رضائے الٰہی میں راضی ہیں، شکوہ تو الگ رہا، ہم تو لفظ کیوں بھی اپنی زبانوں پر نہیں لائیں گے۔ اور اگر میری کسی کوتاہی سے، میرے تساہل، میری ناسمجھی سے تو نے وہ رزق ابھی ہمیں سونپنا شروع نہیں کیا جو ہمارے نام کا تیری تحویل میں ہے تو اے مٹّی لے، فضل علی اپنے رب کے نام کے ساتھ پھر سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے ــــ پھر سے تجھے سنوارتا ہے، پھر سے تیری خدمت کرتا ہے۔"

یہ کہا اور جھٹکے سے اُٹھ کھڑے ہوئے، پھاوڑا سنبھالا اور اسی طرح جھکے جھکے پھاوڑا چلاتے قدم قدم بڑھنے لگے۔ وہ پھاوڑے کی ہر ضرب پر منھ ہی منھ میں اللہ اللہ کہتے جاتے تھے۔ جمی ہوئی مٹّی کی بے مروّت چھاتی کو نئے انکھووں کے لیے نرم کرنے کا یہ کام کتنے گھنٹے جاری رہا۔

یہ کام گھنٹوں سے ــــــ دنوں سے جاری تھا۔

اور جب تہجّد کا وقت ہو گیا تو اسی مٹّی سے تیمّم کیا اور اسی مٹّی پر سجدہ ریز ہو گئے۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو بے رنگ دُھواں دُھواں آسمان کچھ اور نیچے اتر آیا۔ دن بھر کی تپش کے بعد چند گھنٹوں پہلے تانبے سا تپنے والا آسمان اس وقت ایک خفیف سی ٹھنڈک اتار رہا تھا مگر خشک سالی کی ماری ہوئی سوکھی لکّڑ زمین اس ٹھنڈک کو اترتے ہی اچک لیتی، ان دیکھے بخارات میں تبدیل کرتی اور پھر لوٹا دیتی تھی۔

یہ سال ۱۸۹۶ء تھا، بارش سے ترسی ہوئی زمین جیسے کچھ بھی پیدا کرنے سے انکاری تھی۔ میانوالی قحط کی لپیٹ میں تھا۔ جانوروں کے لیے چارا نہیں رہا تھا۔ انسانوں کے چہروں پر گرد اُڑ رہی تھی۔ ایک وقت کا کھانے والے اب دو دو تین تین دن بھوک سے نڈھال پڑے رہتے۔ پہلے جانور دُبلے ہوتے پھر ایک ایک کر کے مرنے لگے۔ فضل علی کے بَیلوں کی جوڑی ٹوٹ گئی۔ ایک بَیل کافی چارا نہ ملنے کے سبب مر گیا تو فضل علی نے دوسرے بَیل کو ذبح کیا اور اپنے ہمسایوں کے دروازوں پر دستک دے دے کر سب گوشت بانٹ آئے۔ تین بکریاں اور ایک ڈاچی جو دودھ سے خالی تھیں اسی طرح قریب و دور کے ہمسایوں کو

کھلائی جا چکی تھیں۔ دودھ دینے والی چند بکریاں رہ گئی تھیں۔ جن کے لئے فضل علی سارا سارا دن چارے کی تلاش میں سرگرداں رہتے اور شام کو جتنا کچھ دودھ حاصل کر پاتے اُن گھروں میں بانٹ آتے جہاں شیر خوار بچّے تھے اور مریض اور جاں بلب بوڑھے کچّے فرش پر چٹائیاں ڈالے پڑے دن گن رہے تھے۔ رات فضلِ علی کے لیے سخت تر مشقّت کی خبر لے کر آتی تھی۔ ان کے چھوٹے سے کھیت میں دو بار بیج ڈالا جا چکا تھا اور دھول کے ساتھ مِل کر دھول ہو چکا تھا۔ کیونکہ زمین اپنا قیمتی تم کھو چکی تھی۔ بارشیں ہوتی نہیں تھیں۔ کنوئیں خشک تھے اور دریا دور تھا۔ اتنی دور سے گاڑیوں میں اور جانوروں پر اور آدمی اپنے سَروں پر ڈھو ڈھو کر جو پانی لاتے وہ انسانوں اور جانوروں کے لیے ہی ناکافی ہوتا تھا تو زمین کے حصّے میں کیا آتا۔ ایسا لگتا تھا کہ جان کی طرح جو قیمتی بیج اور پانی زمین کو دے دیا، بس دے دیا۔ وہ ضائع ہوا۔ زمین کو تاتی کچھ نہیں تھی ۔ کھیتوں میں اناج کے اکھوے نہیں پھُوٹے، دھول کے جھکّڑ اور ریت کے بھنور بنتے رہے اور آگ کی لپٹوں کی طرح زمین سے بخارات اُٹھتے رہے۔ یہ سب تھا مگر فضل علی کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ وہ عشاء کی نماز کے بعد اللہ کا نام لے کر اپنے کھیت پر پہنچ جاتے اور فجر تک پھاوڑا چلاتے رہتے بَیلوں کی جوڑی گھڑی دو گھڑی میں جتنا ہل پھیر لیتی ہے اتنا کام فضل علی سے ساری رات میں ہو پاتا۔ مگر ایسا تھا کہ زمین کی تحویل میں خلق اللہ کے نام کا جو رزق تھا وہ تو اللہ کی مخلوق کے لئے اس سے حاصل کرنا ہی تھا۔

میانوالی کا یہ شہر کالا باغ ضلع بھر کے شہروں، دیہاتوں میں سب سے

کم قحط سے متاثر ہوا تھا۔ دوسری بستیاں تو اس سے کہیں زیادہ سختی جھیل رہی تھیں۔

پہاڑی پر بسے کالاباغ کے چھوٹے چھوٹے مکان گڑیوں کے گھروندوں کی طرح بے ترتیبی سے بکھرے ہوتے اوپر تک چڑھتے چلے گئے تھے۔ نیچے سندھ دریا بہہ رہا تھا۔ یہاں پانی ہی پانی تھا۔ پانی میں انسانوں کے لئے خوراک تھی اور دریا سے ملے ہوتے کھیت کچھ پیداوار بھی دے رہے تھے۔

مگر یہ کھیت بڑے والوں کے تھے اور دریا پر مچھلی پکڑنے کا ٹھیکا ڈاڈے ملک کا تھا جو کبھی کبھار خیر خیرات کی طور پر گھنٹے دو گھنٹے کے لئے یا گھر، باڑے اور زمین کے چھوٹے ٹکڑوں کے عوض دو دو چار چار دن کے لئے مچھلی پکڑنے کی اجازت دے دیتا تھا۔ جب اس کے آدمی کاغذ پر انگوٹھے لگوا کر گھروں اور باڑوں سے گزر جاتے تب ہارے ہوتے جواریوں کی طرح مرے مرے قدموں سے گھر یا زمین کے سابقہ مالک اپنے جال اور مچھلی کے شکار کی چھڑیاں اٹھاتے دریا کے کنارے پہنچتے اور دو چار دن تقدیر آزماتے۔ ان کے نصیب کا جو کچھ ملتا دریا سے حاصل کر لیتے۔ بغیر اجازت مچھلی پکڑنے والوں کا حشر چوروں سے بدتر کر دیا جاتا تھا۔ ڈاڈا ملک اور اس کے آدمی اپنے حق کی حفاظت کرنا جانتے تھے۔ اچھے دنوں میں خدا کے نام پر خیرات نکالنے والے ملکوں نے قحط کی بھیانک شکل دیکھ کر اپنی اناج کی کوٹھیوں کے منھ بند کر دیے تھے۔ پھر اُن سے اپنے ہمسایوں کی بھوک نہ دیکھی گئی تو اکثر نے اناج کی حفاظت کے لئے کوٹھیوں اور کھیتوں پہ اپنے لٹھ بند بٹھا دیے اور علاقے سے چلے گئے۔ کھیت، کھلیان اور گلیارے ویران ہو چکے تھے۔ بھوکے جانور جہاں گر جاتے پھر اُٹھ نہ پاتے۔ موت خاموشی کے ساتھ انھیں زندہ رہنے کے مشکل کام سے نجات دلا دیتی تھی۔ اب تو انسان بھی

موت کا بھیانک ہاتھ اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہے تھے۔ دوستیاں، محبتیں، جان پہچان، ہمسائگی اور مروّت جیسے پورے ضلعے سے اُٹھتی جا رہی تھی جس کے پاس ایک دو وقت کے کھانے کو ہوتا وہ گھر میں بند ہو جاتا کہ کہیں پڑوسی کی بھوک سوال بن کر سامنے نہ آ کھڑی ہو۔ کیسی شرمندگی تھی کہ ہمسائے سے ہمسایہ آنکھ ملانے کی ہمّت نہیں کرتا تھا۔ منھ چھپاتے چھپاتے پھرتا تھا۔ جنھیں وسائل میسّر تھے، جن کے پیروں میں اتنا دم تھا کہ انھیں عذاب جھیلتے ہوئے ان علاقوں سے کھینچ کر لے جا سکتے، وہ جا چکے تھے۔ دریا سے دور پانی سے ترسی ہوئی زمینیں یوں لگتی تھیں جیسے ان کے مالک مدّتیں ہوئیں مر چکے ہوں اور اب ان زمینوں کا وارث کوئی نہ ہو۔ جس زمین کے ایک ایک بالشت کے لئے کچہریوں میں برسوں مقدمے چلتے، لاٹھیاں کھنچ جاتیں اور سر پھوٹتے تھے وہ اب بے دعویٰ خشک سالی کے حوالے کر دی گئی تھی۔

دریا سے دور ایک فضل علی کا قطعۂ زمین تھا کہ انسان کی محنت کے آثار لیے سارا سارا دن سفاک سورج کی بے رحم لپٹوں میں مٹیالے کپڑے کے بہت بڑے تھان کی طرح کھُلا ہلتا رہتا۔ شام ہو جاتی، رات آتی تو پھر وہی ہوتا کہ ایک کشیدہ قامت سایہ جوانی کی جِلَت بھرت کے ساتھ اللہ اللہ کے آہنگ پر پھاوڑا چلاتا کھیت میں بیتابانہ گشت کرتا اور ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی میں رات سے صبح کر دیتا۔ فضل علی گھڑی بھر کو دم لینے بیٹھتے تو مشقّت سے دُکھتے ہوئے بدن کو آرام تو کیا ملتا تھکن کچھ اور گہری ہو جاتی اور طرح طرح کے وہم دل کو گھیر لیتے۔ یہ آخری دانے بھی اکھوے نہ لاتے تو سب کا کیا ہوگا۔ مگر توکّل کا مہربان ہاتھ دل پر اپنا ٹھنڈا سایہ ڈالتا، یاد آتا کہ رزّاق فضل علی تو نہیں ہے، پھر فکر کس بات کی، فضل علی کا کام تو محنت کرنا ہے سو وہ کیے جاتا ہے۔ اور فضل علی کا کام تو اپنے رب سے گڑگڑا کر اپنے ہمسایوں کے

لیے اور اپنے لیے مانگتا ہے. سو مانگے جاتا ہے۔ وہ وسوسوں پر توبہ و استغفار کرتے اور پھاوڑے کا دستہ پکڑ اٹھ کھڑے ہوتے۔

مگر یہ بے رحم حقیقت کشتِ جاں پر گرد و غبار کے بھورے بادلوں کی طرح مسلط تھی کہ یہ دانے جو بکھیرے جاتے ہیں آخری ہیں اور آدمی کے بس میں جتنا کچھ تھا وہ کیا جا چکا اور اب صرف دریا سے ڈھو ڈھو کر پانی لانا اور دعا کرنا ہی رہ گیا ہے۔

بھوک اور مایوسی کے ہاتھوں کیا بوڑھے کیا جوان سب ہی نڈھال ہو گئے۔ کے وہ جوان جو علاقہ چھوڑ کر نہ جا سکے تھے اور فضل علی کے کُنبے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے یا ساتھ کے کھیلے ہوتے تھے یا اُن کی ثابت قدمی اور جذبۂ خدمت سے متاثر تھے کبھی کبھی اُن کا ہاتھ بٹانے آموجود ہوتے۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ دوسرے جو تھے کبھی کچھ پیٹ کو مل گیا تو نوجوانی کی غیرت نے جوش مارا اور اپنے اپنے پھاوڑے، مشکیزے، چھاگلیں اور برتن لے کر آ گئے اور پتھر سی زمین سے کچھ دیر جھوجھ لیے۔ کبھی تو یہ تعداد بارہ پندرہ تک پہنچ جاتی اور کبھی کبھی تایوں، چچوں، پھوپیوں کے دو تین بیٹوں کے سوا کوئی اور نہ ہوتا۔ بڑی جماعت دریا سے پانی لانے چلی جاتی جو بجائے خود پہاڑ سر کرنے کے برابر تھا۔ ایک دو نوجوان فضلِ علی کے ساتھ زمین توڑنے بنانے میں لگ جاتے۔ مگر یہ کام نسبتاً زیادہ تھکا دینے والا، زیادہ ہمت شکن اور صبر آزما تھا۔ فضل تنہا ہوتے تو خاموشی سے سر جھکائے ذکر کرتے رہتے۔ سانسوں کی آون جاون کے ساتھ اللہ اللہ کا ورد جاری رہتا۔ کوئی ایک بھی جوان ساتھ ہوتا تو فضل لہک لہک کر قرآن سناتے، ساتھ ساتھ اپنے علاقے

کی زبان، اپنے محاورے میں ترجمہ بھی کرتے جاتے۔ ان کی سادہ پُر اثر آواز سناٹے میں دُور تک تیرتی چلی جاتی۔ ہاتھ پھاوڑے کے دستے پر جمے اپنا صبر آزما کام جاری رکھتے اور ادھ کھلی آنکھیں جیسے مٹی پر پھیلتی تاروں کی ہلکی چمک میں اپنے ربّ کی نشانیاں ڈھونڈتی رہتیں۔

ایک رات اسی طرح تلاوت اور ترجمہ جاری تھا۔ فضل سورہ رحمٰن پڑھ رہے تھے کہ دریا سے آتے ہوتے پانی لانے والی جماعت میں ایک جوان پانی کے چھلکتے برتنوں سے بھری گاڑی دھکیلتے دھکیلتے ذرا کمر سیدھی کرنے کو رُکا، دُور سے فضل علی کا پُرسوز لحن سُن کر نیم دلی سے ہنسا اور بجھی ہوتی آواز میں ایک تھوڑی سی چمک شامل کر کے بولا "بھائی فضل علی، ربّ کو اس کا وعدہ یاد دلا رہے ہیں"۔ دو ایک نے خوش مزاجی سے اتّفاق کیا اور یہ سب گاڑی کھینچتے پھر چل پڑے۔ کھیت پر پہنچے تو فضل اور اُن کے ساتھیوں کو خاموشی سے کام کرتے ہوتے پایا۔ فضل علی ایک رکوع پڑھنے کے بعد خاموش ہو گئے تھے۔ بس پھاوڑوں کی کھسَر کھسَر سنائی دے رہی تھی یا مشقّت کرنے والوں کی گہری گہری سانسیں۔

ٹیڑھی میڑھی ٹاہلی کے پاس پہنچ کر پانی لانے والوں نے گاڑی سے برتن اتار اتار کر رکھنا شروع کر دیے۔ ایک ایک کر کے برتنوں کے پاس آ گئے اور آبخورے بھر بھر خالی پیٹ کو ٹھنڈے پانی سے بہلانے لگے۔ کچھ نے چلّو میں پانی لے کر منھ پر چھینٹے مارے اور امکان بھر تازہ دم ہونے کی کوشش کی۔ آخر میں فضل علی اپنا پھاوڑا کاندھے پر رکھے سر جھکاتے سب کے پاس آ کھڑے ہوتے۔ کسی نے چھلکتا ہوا آبخورہ ان کی طرف بھی بڑھا دیا۔ گھٹنوں سے پھاوڑے کا دستہ ٹکا کر دونوں ہاتھوں سے آبخورہ سنبھالا، بیٹھ گئے، ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور پانی لانے والے اس نوجوان کی طرف دیکھ کر کہ جس نے ربّ کو وعدہ یاد دلانے والا فقرہ کہا تھا آہستہ

سے بولے، "بیٹیے ـــــ ابھی ابھی اپنے رحمٰن والی سورۃ پڑھتے ہوئے میں نے ایک بات سوچی تھی اور رب معاف کرے تھوڑے سے شکوے کے ساتھ سوچی تھی کہ میں جو یہ نعمتوں والی آیتیں پڑھ رہا ہوں اور جو میرا نعمتوں والا رب ہے تو اس میووں، پھلوں، اناجوں والے نے سیانوالی کو کہیں بھلا تو نہیں دیا۔ اور میں کیڑا فضل علی کہیں اس خزانوں، بھنڈاروں والے کو رحمٰن والی سورۃ پڑھ پڑھ کر یاد تو نہیں دلانے لگا۔"

پھر زخمی پرندے کی طرح چیخ ماری اور کانپتی ہوئی آواز میں پکارے،

"او میری یہ مجال کہ میں اس رزقوں والے کو اس کی رزاقی یاد دلاؤں ـــــ او میری یہ مجال، میری یہ مجال۔"

پھر وہ آہستہ آہستہ کچھ پڑھنے لگے۔ دونوں ہاتھوں میں آبخورہ اسی طرح سنبھالا ہوا تھا۔ پسینے میں تر اپنی پیشانی کو آبخورے کی ٹھنڈی سطح سے مَس کیا اور دھیرے سے بولے۔

"پر بیٹیے، مجھے سمجھ آگئی، پڑھتے پڑھتے بھول تو میں گیا تھا، بھولنے والا تو فضل علی ہے، بھولنے والے تو ہم سب ہیں۔ اس کی رحمتوں والی ہوا تو بہہ رہی ہے۔ اس کا نعمتوں والا دریا تو اچھل رہا ہے..."

پھر انھوں نے اپنی کھُردری ہتھیلی کا پیالہ سا بنا کر اس اُلٹے پیالے سے مٹّی کو تھپکی دی:

"او یارو، اس کے نعمتوں والے اناج تو یہ سوتے پڑے ہیں۔"

دوسروں کی طرح وہ نوجوان بھی جسے فضلِ علی نے بیٹیے کہہ کر پکارا تھا، سنّاٹے میں

کھروا اُن کی بات سُن رہا تھا۔ خاموش رہنے والے بھائی فضل آج اتنے جذبے اتنے جوش سے اتنی بہت سی باتیں کہہ گئے اور یہ کیسے ہوا کہ جو بات میل آدھا میل دور بِیّبے نے چلتے چلتے سوچی اور خوش مزاجی سے اپنے ساتھیوں سے کہہ دی' وہی بات، بھائی فضل بھی سوچتے تھے اور اُس کا اور اپنا حساب کرتے تھے۔ بِیّبے نے فضل علی کو اس حال میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ سیدھا سادہ خاموش طبیعت جوان، پورا بچپن جس کے ساتھ کھیل کود میں بسر کیا، لڑکپن دریا کنارے دوڑیں لگاتے، پہاڑی ٹیلوں پر چڑھتے اترتے گزارا آج اتنی گہری باتیں کر رہا ہے۔ خدا مست لوگوں کی کچھ دن کی صحبت نے اس پر یہ کیسا جادو کر دیا ہے کہ سیانوں کی طرح اپنے اور دوسروں کے اندر اُتر کر گتھیاں سلجھانے لگا ہے۔ کیا مسلسل فاقوں نے اور دن رات کی جان توڑ محنت نے اس میں چھپی ہوئی کوئی قوّت بیدار کر دی ہے جو یہ دلوں میں جھانکنے لگا، خیالوں کو پڑھنے لگا، پڑھانے لگا۔

بِیّبے کو اپنے لڑکپن کا وہ فضل یاد آیا جو اُس کے ساتھ صرف اس لئے صبح تڑکے گھر سے نکل جاتا اور شام تک .....

..... صبح تڑکے گھر سے نکل جاتا اور شام تک کالا باغ کی پہاڑیوں کے ایک ایک درخت پر چڑھتا اُترتا کہ کہیں اُس کو طوطے کا گھونسلا مِل جاتے۔ وہ طوطے کا بچّہ پالنا چاہتا تھا۔ کہتا تھا میں اُسے بولنا سکھاؤں گا۔

بِیبا گھونسلے کی تلاش میں تھک چکا تھا، ایک ہی کھیل آخر کتنے دن تک کھیلا جاتا، اُس نے جھلّا کر کہہ دیا؛ "او فضل پہلے خود تو بولنا سیکھ لے طوطے کو کیا پڑھائے گا۔ پہلے خود تو پڑھ لے،، فضل خاموش ہو گیا دونوں نے اس دن سے درختوں پر چڑھنا اُترنا، کالا باغ کی پہاڑیوں کا گشت لگانا چھوڑ دیا۔ بِیّبے کو بعد میں افسوس بھی ہوا کہ فضل کا اتنے مزے کا کھیل اس نے ختم کرا دیا۔ اُس نے ایک دن فضل علی

کو پھر سے آمادہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ اُس سے کہا بھی کہ یارا ہنسی کی بات کا تُو نے اتنا اثر لیا ہے۔ چل درختوں میں طوطے بولنے لگے ہیں۔ ہری ہری ٹکڑیاں دریا کے پار سے آ آ کر کالا باغ کے جھُنڈوں میں اُترنے لگی ہیں۔ ایک ہی چکّر میں تیرے مطلب کا بچّہ مِل جائے گا مگر فضل ہنس کر ٹال گیا۔ بیبے نے بہت پچھا لیا تو کہنے لگا، "بیبے تُو نے ٹھیک کہا تھا طوطا پڑھانے میں کوئی مزا نہیں۔"

پھر اُس نے کتنی روز فضل کو بستی میں نہیں دیکھا۔ دریا کنارے کبڈّی کے مقابلوں میں، بازاروں باڑوں میں فضل کہیں نظر نہ آیا تو گھر والوں سے اُس کی خیر خیریت پوچھنے نکلا۔ دیکھا کہ گھر والے تو کہیں گئے ہوئے ہیں۔ فضل کی کوٹھری سے اُس کے زور زور سے قرآن پڑھنے کی آواز آ رہی ہے۔ بیبا باہر کھاٹ پر جا بیٹھا اور انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر میں فضل کی رشتے دار ایک ضعیفہ ادھر سے گزری تو اُسے خاموشی سے کھاٹ پر بیٹھے دیکھا، پوچھنے لگی یہاں کیسے بیٹھا ہے اندر کیوں نہیں جاتا۔ بیبے نے کہا کہ بھائی فضل تلاوت کر رہا ہے۔ وہ پڑھ لے تو پھر اندر جاؤں۔ "اُس کا پڑھنا نہیں ختم ہوتا۔ تُو اندر چلا جا، بات کر لے۔" بیبا اندر گیا تو دیکھا کوٹھری کی واحد چھوٹی سی کھڑکیا کے پٹ بند ہیں۔ کھُلے دروازے سے آتی ہلکی روشنی میں فضل اپنے بستر پر بیٹھا تکیوں پر قرآن مجید رکھے ایک سرشاری کے عالم میں تلاوت کر رہا ہے۔ بیبا دروازے پر رُکا اور پھر وہیں کھڑا رہ گیا۔

چند روز میں اُس کا دوست فضل علی کوئی دوسرا ہی فضل ہو گیا تھا۔ چہرہ سُتا ہوا تھا جیسے کسی گہری فکر نے اس کے لڑکپن کے بھرے بھرے چہرے کو نچوڑ لیا ہو۔ مگر یہ کسی بیمار چہرے کے نقوش نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے مشقّت سے خوب تپے ہوئے چہرے پر کسی اَن دیکھی آنچ کا عکس پڑ رہا ہو۔ دروازے سے آتی روشنی اور تکیوں پر رکھے مصحف کے درمیان ایک سایہ آ کھڑا ہوا تو فضلِ علی نے نظر اٹھائی۔ بیبے نے

اُس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں تو دیکھا کہ ایک عجب طرح کا سویا سویا پن اور دُوری ان آنکھوں میں تھی۔ لمحے بھر کو بیبے نے محسوس کیا کہ وہ کسی اجنبی کے سامنے کھڑا ہے اور خود اُس کے لئے اجنبی ہے۔ پھر پہچان کی ایک تیز لہر اُن آنکھوں میں دوڑ گئی۔ فضل علی نے زیرِلب "صدق اللہ العظیم" کہہ کر مصحف کو بند کیا۔ بوسہ دیا اور آہستگی کے ساتھ بستر سے اُتر آیا۔

"آؤ بیبے، کدھر رہ گیا تھا یارا؟"

یہ آواز اس کے بچپن کے دوست فضلِ علی کی تھی، وہی کھلنڈرے پن کی چمک، وہی بے تکلفی، وہی لڑکپن۔ بیبے نے اُس کے بڑھتے ہوتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا اور وہ دونوں کوٹھڑی سے باہر آگئے۔

"میں کدھر ہی رہ گیا تھا کہ تو آپ گھر میں گھسا بیٹھا ہے؟"

وہ دونوں فضل کے باڑے میں آگئے۔ باتیں کرنے لگے۔ بیبے نے فضل کی غیر حاضری میں ہونے والے واقعات، کھیل، لڑائی بھڑائی کے قصے تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ فضل سے اُس کے اچانک گھر بیٹھ جانے کے بارے میں پوچھے مگر ہر بار اُسے نیم روشن کوٹھڑی میں بستر پر بیٹھے ہوتے اس دوسرے فضل علی کا اجنبی چہرہ یاد آجاتا اور وہ کچھ اَور باتیں شروع کر دیتا۔ اِن کھلنڈری باتوں کے درمیان وہ اُس نئے فضل علی کو بھول جانا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس بات سے خوفزدہ تھا۔ آخر رخصت ہوتے ہوتے بیبے نے ہمّت کر کے پوچھ ہی لیا کہ کل ٹلوٹے کا گھونسلا تلاش کرتے فضل اس کے ساتھ چلے گا کہ نہیں۔ فضل نے ہنستے ہنستے ایک لفظ میں جواب دیا۔ "نہیں"۔

اب جو بات کہہ دی تھی تو بیبا اسے ادھوری نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ "او یار۔ ابھی تک تجھے غصّہ ہے؟"

"کیسا غصہ؟" فضل علی نے واقعی حیران ہو کر پوچھا۔
"یہی جو میں نے تجھے طعنہ دیا تھا کہ پہلے خود بولنا سیکھ لے، پہلے خود پڑھ لے۔"
"اچھا..... وہ۔" فضل علی بہت دیر تک خاموش کھڑا رہا، پھر آہستہ سے کہنے لگا۔ "تو نے طعنہ نہیں دیا تھا یارا، ٹھیک کہا تھا۔ وہ طوطا پڑھانے میں کچھ مزا نہیں۔" پھر دھیرے سے اپنے سینے کو تھپتھپا کر بولا "اب تو یہ طوطا پڑھاؤں گا۔" بیبے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔
وہ جو کبڈی کے مقابلوں کی بات کرتا تھا اور کیلے کے تنے سے جھپٹ کر دریا کے ساتھ ساتھ بہنے کے کھیل کی سوچتا تھا اور پہاڑیوں پر دوڑ کر چڑھنے اترنے کا قصہ سناتا تھا تو سب باتیں بیبے کی سمجھ میں آتی تھیں لیکن بڑی عمر کے لوگوں کی طرح گہری گہری باتیں کرنا اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر بھی کوشش کر کے اُس نے ایک سوال سوچا اور فضل علی سے پوچھ لیا۔
"فضل، تُو نے مولوی بخشے جی سے کلام مجید تو پڑھ لیا تھا۔ تُو تو پہلے ہی فر فر پڑھنے لگا تھا اب اور کیا پڑھے گا؟"
فضل جواب دینے سے پہلے کچھ دیر رُکا پھر بولا:
"فضل علی کی زبان نے بے شک کلام پڑھ لیا۔ اب فضل علی کلام پڑھے گا۔ مولوی بخشے جی نے حکم دیا ہے۔ میں بابا دامانی کی حاضری میں جا رہا ہوں۔ کل۔"
حضرت خواجہ عثمان دامانی اللہ لوک تھے۔ بیبے نے ان کا نام سُنا تو ادب سے اپنے سر پر ٹوپی ٹھیک کی۔ وہ ایک بار اپنے تایا کے ساتھ حضرت بابا دامانی کے ڈیرے پر حاضری دے چکا تھا۔ ایک سفید بُرّاق بزرگ صاف اور سادہ موٹے کھردرے کپڑوں میں مصلّے پر بیٹھے ہوتے، مسکراتے ہوتے، نرمی اور پیار سے لوگوں کی باتیں سُن سُن کر ان سے اچھی اچھی باتیں کہتے ہوتے، یا خاموش آنکھیں بند کیے

تسبیح پھیرتے ہوتے، اللہ اللہ کرتے ہوتے۔ یہ بابا داماتی تھے۔ بیبا ڈاڈے ملک کو بھی دیکھ چکا تھا۔ رعب دار گھنی کالی مونچھوں والا سُرخ و سفید چہرہ تھا ملک کا، دیکھے سے دہشت ہوتی تھی۔ مگر بابا داماتی کے رعب سے دہشت نہیں ہوتی تھی، بڑا اچھا ٹھنڈا ٹھنڈا لگتا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے ہوتے تو اُن کی آنکھیں ڈاڈے ملک سے دسیوں گنا خوبصورت اور چمکدار لگتی تھیں۔ پھر بھی زیادہ دیر تک بیبا اُن آنکھوں کی طرف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بیبے کو ایسا لگتا تھا جیسے بابا کی طرف ایک دم اس طرح دیکھ کر وہ کوئی گستاخی کر رہا ہے۔

فضل علی —— سے یہ سُن کر کہ وہ بابا عثمان داماتی کی حاضری میں جا رہا ہے بیبا سوچتا رہ گیا۔

یہ فضل میرا دوست اتنے بڑے بابا کی حاضری میں جا رہا ہے۔ یہ اُن سے کلام مجید پڑھے گا۔ یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ مولوی بخشے کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ عثمان داماتی تو اس علاقے میں اللہ کی رحمت کی طرح ہیں۔ جس نے دل لگا کر اُن کی دو باتیں سُن لیں، وہ سمجھو پار اُتر گیا تو یہ فضل علی میرا یار کون سے دریا پار اترے گا۔ یہ جو اتنے ڈاڈے اللہ لوک کی حاضری میں جا رہا ہے تو یہ بے تنک بڑی بات ہے لیکن بیبے کا ایک یار تو اُس سے دُور چلا جاتے گا۔ جوڑی تو ٹوٹ جاتے گی۔ اس بات سے وہ کچھ اداس ہو گیا اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے بوجھل دل کے ساتھ اپنے گھر آگیا۔

اگلا دن بیبے کے لئے بہت اداس کرنے والا دن تھا۔ فضل علی اُس کا یار آج کالا باغ سے جا رہا تھا۔ اللہ لوک درویشوں کے وہاں آدمی کیوں جاتا ہے، بیبے کو معلوم نہیں تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آدمی جا کر لوٹتا ہے تو کیا بن کر آتا ہے۔ مگر ایک بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پھر آدمی وہ نہیں رہتا جو جانے سے پہلے ہوتا ہے

تو فضل علی اور بیبے کی جوڑی ٹوٹ گئی۔ اب دریا میں تیرنے، درختوں پر چڑھنے اور دوڑیں لگانے کا زمانہ ختم ہو گیا۔ فضل علی کے لیے بھی اور بیبے کے لیے بھی۔ یہ بات اس نے تیز تیز قدموں سے مولوی بخشے جی کے ڈیرے کی طرف بڑھتے ہوئے فضل علی کے انداز میں دیکھ لی تھی۔

اُسے یاد تھا، فضل علی گلے میں کلام مجید ڈالے، ہاتھ میں کپڑوں اور بھُنی مکئی کے دانوں کی پوٹلی سنبھالے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر آگے آگے یوں چڑھتا اترتا چلا جا رہا تھا کہ جیسے سفر کے آخر میں اُسے کوئی انعام ملنے والا ہو۔ مولوی بخشے جی کے مکتب میں یہ دونوں ساتھ ساتھ جاتے رہے تھے مگر آج کا جانا عجیب طرح کا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ ایک دو بار بیبے نے فضل سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا ہوا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا تھا اور بس بیبے کو یقین تھا فضل علی نے اس کی بات ہی نہیں سنی تھی، سو اب کیا دیتا۔ آخر چھوٹے ٹبے کے پاس پہنچ کر فضل علی رُکا۔ اپنی پوٹلی ایک پتھر پر رکھ دی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بیبے سے معانقہ کیا۔ کہنیوں سے اوپر اس کے بازو تھام کر ہلکا سا جھٹکا دیا اور بس ایک فقرہ کہا "بیبے یارا میرے لئے دعا کرنا۔" بیبے نے سر ہلا کر وعدہ کر لیا۔ یہ لوگ نماز کے بعد تو دعا کرتے ہی تھے۔ اور رب سے اچھی صحت، روزی رزق کے لیے اور اپنے ماں باپ کے لیے دعا مانگتے تھے مگر یاروں دوستوں کے لئے دعا کرنے والی بات بیبے نے کبھی نہیں سوچی تھی۔ ٹھیک ہے یار دوست بھی تو ماں باپ کی طرح پیارے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے بھی دعا کرنی چاہیئے۔ بیبے نے ٹبے سے اترتے ہوتے سوچا۔ گھوم کر دیکھا تو فضل علی جا چکا تھا۔

وہ فضل علی جسے بیبے نے ٹبے سے رخصت کیا تھا لوٹ کر پھر نہ آیا۔ دنوں بعد، بہت دنوں بعد بھائی فضل علی ضرور آیا، جس کے گالوں پر چھوٹی سی نرم ریشمی

ڈاڑھی تھی۔ جس کے بال لہراتے ہوئے کاندھوں تک آتے تھے، جو سر جھکا کر آہستگی سے کبھی ایک آدھ فقرہ کہہ دیتا تھا ورنہ ہر وقت منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا رہتا تھا۔ جو کالا باغ کے غریبوں، مفلسوں کے لیے ہر وقت مستعد رہتا تھا۔ جسے خالی فضل یا فضل علی کہتے ہوئے اب جھجک محسوس ہوتی تھی۔ یہ تو بھا فضل یا بھائی فضل علی تھا جسے بڑے بوڑھے بھی کھڑے ہو کر تعظیم دیتے تھے۔ جو بے آسرا بوڑھوں، اپاہجوں کے کپڑے اُٹھا کر دریا پر چلا جاتا اور انہیں دھو سکھا کر لے آتا۔ بیماروں، بے گھروں، مسافروں، کے لیے اپنے گھر باڑے سے مکئی کی روٹی اور دو دھلے کر سب سے پہلے آموجود ہوتا اور جب سے رَب میانوالی پر غصہ ہوا تھا اور بارشیں جیسے ادھر آنا بھول گئی تھیں اور بھوک اور قحط کے بدصورت گدھ کالا باغ کے ٹیلوں ٹبوں پر آن بیٹھے تھے، بھائی فضل کسی جلالی درویش کی طرح زمین کی چھاتی سے چمٹ گیا تھا۔ ہلکان ہو ہو کر اس سے اللہ کے بندوں کا حق طلب کر رہا تھا۔

اوّل اوّل تو اس نے مَلکوں، معتبروں کو اللہ اور رسولؐ کا حکم سنایا تھا ہمسایوں کے حق کا واسطہ دیا تھا اور خیر خیرات کے طور پر انسانوں کے لیے تھوڑا کچھ اناج اور جانوروں کے لیے گاڑی دو گاڑی چارا حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر جیسے جیسے عذاب کے دن لمبے ہوتے گئے مَلکوں، معتبروں کی آنکھوں میں خود غرضی کے گدھ آ آ کر بیٹھنے لگے۔ لالچ نے سرداروں کو عامیوں کا محافظ نہ رہنے دیا۔ معتبروں کو نامعتبر بنا دیا اور کالا باغ کے غریبوں مسکینوں کے لیے ان کی ڈیوڑھیوں سے ملنے والے دانے کم سے کم ہوتے گئے، پھر وہ دن آئے کہ مَلکوں نے میانوالی کو خیرباد

کہااور اپنی دوسری ہری بھری زمینوں پر آرام کرنے چلے گئے۔ لوگوں نے سُنا کہ ڈاڈا ملک کسی باہر والے کو دریا پر ماہی گیری کا ٹھیکا دے کر خود کہیں جانے والا ہے تو انھوں نے بھاق فضل سے درخواست کی کہ وہ بات کریں۔ آخر کالا باغ سے گزرنے والے دریا پر کالا باغ کے لوگوں کا حق نہیں ہوگا تو اور کس کا ہوگا۔ بڑے بوڑھوں نے ڈاڈے ملک کے کارندوں سے گھگھیا کر کہا کہ ملک کی روبکاری میں بھاق فضل کی پیشی کرادو، اسے کچھ عرض کرنا ہے تو انھوں نے مونچھیں مروڑتے ہوتے جواب دیا "قریشیوں کے بڑے بوڑھے کدھر گئے جو ان کے بچّے ڈاڈے ملک کے سامنے درخواست گزارنا چاہتے ہیں؟ اپنے بھا فضل سے کہو اُسے اپنے کٹمب کے لیے بوری دو بوری دانے چاہئیں یا مال مویشی کے لیے گاڑی بھر چاپا درکار ہے تو ہم سے بات کرے۔ یہ سب چھوڑے جو کر رہا ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش یہ جو خدائی فوجدار اور درویش بنا پھرتا ہے تو بات ابھی ڈاڈے ملک تک نہیں پہنچی ہے اس سے کہو دوسروں کی طرح بندہ بن کے رہے۔ ہم اس کے لیے مہینے دو مہینے کا بندوبست کرائے دیتے ہیں۔ باقی پورے میانوالی کا ٹھیکا نہیں لیا ہے کسی نے۔ مصیبتیں سب پر آتی ہوتی ہیں ——— ہاں" اور وہ مونچھیں مروڑتے ہوئے چلے گئے۔

دنیوی وسیلوں میں اب صرف یہ قطعہ زمین ہی تھا جس سے بھاق فضل تن تنہا جوجھنے پر کمر باندھ چکے تھے، ان کے ساتھ گنتی کے یہ چند جوان تھے۔ یہ لوگ دو بار بیج ڈال چکے تھے۔ اب تیسری بار بیج بکھیرا جا رہا تھا۔ پرانے کسانوں نے مایوسی سے سر ہلاتے۔ "بھاق فضل کو سمجھاؤ کہیں ایسے فصلیں اُپجتی ہیں۔ دانے مٹّی میں ملانے سے فائدہ۔؟"

مگر قطرہ قطرہ پانی اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ اس امّید پر کہ اللہ کے کرم سے اکھوے اس زمین میں پھوٹیں گے تو آنے والے دنوں میں شاید پیٹ بھر کم کھانے کو ملے۔

تو یہ مشقّت کے اس مرحلے کی آخری رات تھی اور بھاق فضل نے کھیت کے

بیچ بیٹھ کر اس کی بے مروّت مٹی کو یوں تھپکی دی تھی جیسے وہ اُن کی سدھائی ہوئی گھوڑی ہو اور بیبے سے اپنے ہم عمر جوانوں سے بڑے جذبے، بڑے جوش کے ساتھ کہا تھا کہ رزقوں والے رزّاق کے نعمتوں والے اناج تو یہ سوتے پڑے ہیں۔

بیبے نے ایک جیب سے بھروسے کے ساتھ تاروں کی دھندلی چمک میں پڑے ہوئے کھیت کی طرف دیکھا۔ کیا پتہ بھائی فضل کی تھپکی ان سوتے ہوئے اناجوں کو جگا ہی دے۔ اللہ کے لاڈلوں، اس کے مستی والے درویشوں کے پارس سے چھو کر اب جو بھائی فضل کندن ہو آیا ہے تو شاید مولا کریم اُس کی لاج رکھ لیں گے۔

صبح ہوتے ہوتے درویشوں کے پارس سے چھو کر کندن بن جانے والے فضل علی نے کام ختم کیا اور باجماعت نمازِ فجر ادا کی۔ اپنی محنت میں برکت کے لیے دعا مانگی اور ٹاہلی کے ٹیڑھے درخت کی ایک موٹی جڑ پر سر ٹکا کر لیٹ گئے اور بے بادل آسمان کو گھورتے رہے۔

پتہ نہیں اندر کندن بنا کر رانگے کا رانگا ہی رہا۔ پتہ نہیں طوطے نے پڑھ کے دیا کہ گونگے کا گونگا ہی رہا۔ کالا باغ سے پہلی بار نکلنا انھیں یاد تھا۔

حضرت خواجہ عثمان دامانی کی حاضری میں جب انھیں پیش کیا گیا تو اُن سے زیادہ مولوی بخشے جی کی حالت غیر تھی۔ ہکلا ہکلا کر مولوی جی نے کہا کہ حضور خواجہ سائیں یہ بچہ اللہ کے کلام سے محبّت کرتا ہے۔ تجوید اس حقیر کو جتنی آتی تھی سکھلا

دی۔ ترجمہ اور تفسیر اس دربار میں سیکھ لے گا اور خواجہ سائیں سرکار کی نظر ہو گئی تو راہِ سلوک پر چل پڑے گا۔ آگے اس کے نصیب۔ بندگانِ خدا کے کام آنا اس نے اپنے کٹمب قبیلے سے سیکھا ہے —— کالا باغ کے سجل قریشیوں کا پتر ہے ویسے اَن گھڑ کسان بچّہ ہے —— اجازت ہو جائے تو حاضری میں موجود رہے۔

سفید ترّاق خواجہ سائیں کے مسکراتے ہوئے چہرے پر جیسے خاص فضل علی کے لیے پیار کی ایک لہر آئی۔ وہ کچھ دیر فضل علی کے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھتے رہے۔ اشارے سے قریب بلایا، شانے پر ہاتھ رکھا اور میٹھی آواز میں بولے:

" اَن گھڑ ہے مگر اصیل ہے۔ مولوی جی، بوڑھے عثمان کو اب اتنی مہلت نہیں ملے گی کہ اس بچّے کی خدمت کر سکے۔ چھوڑ جاؤ۔ دَندے والے سیّد سے بات ہو گی۔ آگے جو صاحب کی مرضی۔"

اور یہ صاحب ہی کی مرضی تھی کہ فضل علی، حضرت خواجہ عثمان دامانی کے دامانِ عاطفت کی پناہ میں زیادہ دن نہ رہ سکے۔ خواجہ سائیں نے ان کا ہاتھ اپنے خلیفۂ اوّل سیّد لعل شاہ دندانی سیکسری کے ہاتھ میں دے دیا اور مسکرا کر فرمایا۔ "دندے والے سیّد کے ساتھ چلے جاؤ یہاں سے آگے راستے نکلیں گے۔"

اور دندہ وہ بستی تھی جہاں فضل علی پر اللہ کا کرمِ خاص شروع ہوا۔ سیّد لعل شاہ دندانی نے تربیّت کا آغاز کیا اور مدارجِ سلوک طے کروانے شروع کیے۔ ناتراشیدہ ہیرے کو تراشا جا رہا تھا، آب دی جا رہی تھی مگر فضل علی ابھی لاتعیّن کے دائرے تک بھی نہیں پہنچائے جا سکے تھے کہ صاحب کی طرف سے سیّد لعل شاہ کا بلاوا آ گیا۔

"سیّدی! مرشدی! سیّدی! مولائی!" جھٹکے سے فضل علی اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

نئے سورج کی ہلکی روشنی میں، صبح کی ہلکی خنکی میں ایک تاریک رات کی یاد اپنا گہرا سایہ ڈالتی ہوئی گزر گئی تھی، پسینے میں جیسے نہاتے ہوتے وہ ٹاہلی کے نیچے سے اُٹھے اور تازہ بوائی کیے ہوتے کھیت کی بینڈ پر ٹہلنے لگے۔

پیر و مرشد کی مفارقت کا زخم پھر کیوں رِستے لگا۔ سیّد لعل شاہ کے بعد بھی اللہ نے انھیں بے آسرا تو نہیں چھوڑا تھا۔ ہاں اگر حضرت خواجہ عثمان دامانی کے فرزند خواجہ سراج الدین نہ سنبھال لیتے تو فضل علی تو دَندے ہی میں مر گئے ہوتے۔ یہ صاحب کی مرضی تھی کہ سیّد لعل شاہ دندانی کے وصال کی خبر سُن کر خواجہ سراج تعزیت کے لیے دندے تشریف لائے اور فضل علی کو اس حال میں دیکھا کہ مرشد کے بعد جینے کی اُمنگ جیسے ختم ہی ہو گئی ہے اور گریہ وزاری ہے کہ رُکنے کا نام نہیں لیتی۔

خواجہ سراج الدین کہ اُن کے دادا پیر کے صاحبزادے تھے۔ مرشدی سیّد لعل شاہ کو حقیقی بھائی کے مثل اور باپ کے بعد رہنما جانتے تھے اور خود صاحب حال تھے ـــــــ سو وہ سایہ دار بادل کی طرح آتے اور فضل علی کو نہال کر گئے۔

انھوں نے کالا باغ والے فضل علی کو غم و اندوہ سے پچھاڑیں کھاتے دیکھا تو اپنے درویش باپ کے سے میٹھے لہجے میں پوچھا:

"فضل علی، کیا مرنے والے کا سوگ منا رہے ہو؟"

لہجے کی مٹھاس اور آواز کی کھنک حضرت خواجہ سائیں کی تھی۔ فضل علی نے آنکھیں کھولیں اور دو زانو ہو بیٹھے، سر جھکا لیا مگر آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

خواجہ سراج نے پھر سوال کیا: "فضل علی بیٹے، کیا مرنے والے کا سوگ مت

رہے ہو؟"

"اپنی قسمت کو روتا ہوں خواجہ سائیں۔ میں بدنصیب اُن گھڑیوں کا اُن گھڑا ہی رہا ــــــ مرشد وصال کر گئے۔"

خواجہ سراج نے اسی طرح مہربان لہجے میں پوچھا۔ "کیا پدرِ محترم نے ہاتھ پکڑ کر یہ نہیں کہا تھا کہ سیّد لعل شاہ کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہاں سے آگے راستے نکلیں گے؟"

"بے شک، حضرت خواجہ سائیں درویش نے یہی فرمایا تھا۔"

"تو اللہ کی ذات پر بھروسا کرو، رستے نکلیں گے، جو نعمتیں واپس لیتا ہے، وہی نعمتیں دینا بھی جانتا ہے۔ کیا پتہ ہمارے نصیب میں ہی تمہاری کچھ خدمت کرنی لکھی ہو۔"

یہ بہت واضح حکم تھا۔ فضل علی نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے خواجہ سراج الدین کا دایاں ہاتھ تھام لیا، اُسے بوسہ دیا پھر اللہ اللہ کے نعرے مارتے ہوتے والہانہ رقص شروع کر دیا۔

حضرت خواجہ عثمان دامانی کی نسبتِ راست جو دندہ شریف پہنچ کر بالواسطہ ہو گئی تھی اب بلاواسطہ جاری ہو گئی کیونکہ خواجہ سائیں واصل باللہ کے فرزندِ خوش خصال خواجہ سراج الدین نے فضل علی کو تکمیلِ سُلوک کے آخری مراحل طے کرانے کی خود سے پیش کش کی تھی اور اس ہیرے کو تراشنے آب دینے کا ذمہ لے لیا تھا۔

سو اُس کے بعد موسیٰ خیل کا دربار فضل علی کی تربیّت گاہ قرار پایا۔

اور وقت جو خالقِ زماں کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے وہ گزرتا ہے تو

لگتا ہے ایک بیکراں دریا ہے کہ بہتا چلا جاتا ہے تو کتنی ہی کنکریوں کو توڑ پھوڑ کر ریزہ ریزہ کرتا ہے تو کتنے ہی سنگ ریزوں کو جلا دے کر آبدار موتی بناتا ہے۔

خواجہ سراج الدّین موسیٰ خیل سے بغرضِ علاج دہلی تشریف لے گئے اور چتلی قبر محلّے میں حضرت میرزا مظہر جانجاناں اور حضرت شاہ غلام علی کے مزارات کے سجادہ نشیں حضرت شاہ ابوالخیر کے وہاں قیام کیا۔

تو ایک گوہر آبدار کو تربیتِ صدف سے باہر آنے کا اذن ہوا۔

فضل علی کو باتیس خواجہ کی چوکھٹ سے طلب کیا گیا تھا۔ ارشادِ شیخ تھا کہ فوراً دہلی پہنچو۔ دھڑکتے دل کے ساتھ فضل علی، موسیٰ خیل سے روانہ ہوتے، دہلی پہنچ کر شیخ کی قدم بوسی کی۔ خواجہ سراج نے حکم دیا کہ دستارِ خلافت لائی جاتے۔

فضل علی لرزتے وجود کے ساتھ سر جھکاتے گویا ایک خواب کے عالم میں دوزانو بیٹھے تھے۔ برستی آنکھیں جیسے راہِ سلوک کی تمام مسافتوں کی کہانی سنا رہی تھیں۔ حکم ہوا آگے آؤ۔ جوانِ صالح ارشاد کی تعمیل میں۔ شیخ کے قدموں میں جھکتا چلا گیا۔ خواجہ سراج الدّین نے اپنے ہاتھوں سے دستار باندھی، سندِ خلافت عطا کی تو ایک مستی کے عالم میں شیخ کے سجادے کو بوسہ دیا۔ سندِ خلافت کو اپنی عرق آلود پیشانی پر چسپاں کر لیا، اور اللہ کا نعرہ مار ایسی سرخوشی کے عالم میں رقص شروع کر دیا کہ مجلس میں موجود صاحبان حال وجد میں آ گئے۔

دور دراز کی مسافتیں جھیلتا کالاباغ کے قرابتوں کا جوہر قابل جسے مولوی بخشے جی نے اَن گھڑ کسان بچّہ کہہ کر حضرت دامانی کے دربار میں پیش کیا تھا باتیس خواجہ کی چوکھٹ پر رقص کناں اور نعرہ زناں طلوع ہو رہا تھا کہ اللہ اللہ اللہ۔

اور اللہ اللہ اللہ کرتا زہ بوائی کیے ہوتے کھیت کی مینڈ پر کالا باغ کے روشن آسمان کے نیچے خاکستری رنگ کے گاڑھے کا پیوند لگا کرتا پہنے یہ خواجہ فضل علی قریشی تھے کہ رقص کرتے تھے۔ یہ اپنے بچپن کے دوستوں کے لئے بھا فضل تھے اور کالا باغ کے جوانوں، بوڑھوں، بچوں کے بھائی فضل علی تھے اور اب ہفتوں کی مشقت کے بعد تیسری بار، دریا سے دور پڑی اپنی ضدی زمین میں بیج بکھیرنے کے بعد کسی باطنی اشارے سے خبر پا کر شکر گزاری میں رقص کرتے تھے کہ لگتا تھا، انھوں نے ابھی ابھی مٹی کی خاکستری چادر اوڑھ کر سوتے ہوتے بیج کو اکھوے نکالتے دیکھا ہے۔

فضلِ علی کی مرادوں کی فصل بھی تو تیسرے اشارے پر بارور ہوتی تھی، پہلے خواجہ عثمان دامانی نے پھر سید لعل شاہ دندانی نے ان کی دستگیری کی تھی۔ پھر خواجہ سراج الدین نے رستے پر ڈال خلافت کی سند و دستار دے انھیں بامراد کیا تھا۔ تو اللہ کے کرم سے یہ تیسری بوائی مشکور ہوتی تھی اور طریقت و سلوک کے اکھوے پھوٹنا شروع ہوتے تھے۔

تو شاید یہی کچھ اس کھیت کے ساتھ بھی ہونا ہے اور امر الٰہی بھی یہی ہے، کہ مشقت کی جاتے اور مشقت اور مجاہدے اور ریاضت کے بغیر کیوں کسی کو کچھ ملے۔ تو کیا محبوبِ خدا سے بڑھ کر کہیں کوئی ہُوا ہے، تو کیا ایک پہاڑی کی کھوہ میں بیٹھے سرکارِ دو عالمؐ امرِ الٰہی کی تکمیل میں ریاضت نہیں فرماتے تھے تو اللہ اللہ اللہ محبوب پاکؐ کے صدقے میں میرے دوستوں کی میری اس حقیر ریاضت کو قبول فرما کہ اللہ اللہ اللہ کہ زمین تیری اور موسم تیرے اور آسمانوں سے اترنے والا پانی تیرا اور اُگتی فصلوں کے چٹختے اکھوے تیرے کہ اس خاکستری چادر کو چیر کر تیرے سورج سے آنکھ ملاتے ہیں کہ تیری مٹی سے رس لیتے ہیں کہ تیری ہوا کے ساتھ

لہلہاتے ہیں کہ اللہ اللہ اللہ اور اللہ اللہ اللہ اور اللہ اللہ اللہ۔

خواجہ فضل علی تین شب و روز کھیت کی بیلنڈ پر اُگی ٹیڑھی میڑھی ٹاہلی کے نیچے بخار میں پڑے بھنتے رہے۔ کالا باغ کے جوان ضد کر کے انھیں بستی میں لے آتے تو بستی کی طرف آتے ہوتے بار بار اُن سے وعدہ لیتے جاتے تھے کہ یارو، دریا سے پانی لانے میں کوتاہی تو نہیں کرو گے، دیکھو اکھوے چل پڑے ہیں۔ دیکھو رَب کی رحمت جوش میں ہے اس کی پذیرائی میں کمی نہ ہونے پاتے۔ بتیبے نے خواجہ فضل علی کی جلتی ہوتی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا کہ یارا درویشا فکر نہ کر۔ ہم کالا باغ کے کنکو ہیں پر کسان بچے ہیں۔ درویش کی کھیتی کو سوکھنے نہیں دیں گے۔

پھر ایسا ہی ہوا کہ خواجہ فضل علی کے کھیت نے اکھوے نکالے اور جب پودے بالشت بالشت بھر کے ہوتے تو پورا کالا باغ دیکھنے کو اُمڈ آیا اور لوگوں نے ایک آواز ہو کر کہا کہ کالا باغ نے دنیا کو ایک درویش دیا اور خواجہ فضلِ علی اللہ لوک ہے اور قریشیوں کا سجل پتر تو بابا دامانی کا سچّا جانشین ہے اس کے فیض سے تو میانوالی سے قحط اور بھوک مری دفع ہو گی اور یہ تو ابرِ رحمت ہے بارش لے کر آئے گا اور لوگ اب خواجہ فضل علی قریشی کے حوالے سے بارشوں کی راہ دیکھنے لگے۔
اللہ اللہ کے آہنگ پر رقص کرنے والوں کا دائرہ بڑھنے لگا۔ بات ملکوں تک

پہنچی تو تیک برداروں کی معیت میں مشکی گھوڑے پر چڑھ کر ڈاڈا ملک تک فضل علی قریشی کا کھیت دیکھنے آیا اور وہ بہت مرعوب ہوا۔اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ خواجہ فضل علی کے لیے زندگی آسان کر دی جاتے اور علاقے میں خیر خیرات کے کام بڑھا دیے جائیں۔شاید کہ یہ جوان اللہ لوک ہے۔

اور ایک رات میں کسی وقت خواجہ کی آنکھ کھل گئی تو کسی آواز نے کہا کہ اب تو خلق اللہ کی خدمت میں بڑا مزا ہے کہ فضل علی قریشی کے رستے آسان ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی ناموریاں ملتی ہیں اور اب تو وہ ربّ جی کے چٹیّوں چٹے نام کی، اُس کے نوروں نور نام کی مشعل اٹھاتے ہوتے دوڑا دوڑا جاتے گا اور یہ تو دیکھو اس کے نصیب واہ واہ ہوتے کہ ربّ جی نے طوطے کو نام رٹایا اور اپنے مٹھو طوطے کو خوب خوب اُڑایا کہ دُوروں دُور پہنچایا کہ فضل علی قریشی اب تو دوڑا دوڑا جائے گا کہ جگہ جگہ جا جا کے حق حق اللہ اللہ حق اللہ اللہ کہ اللہ اللہ اللہ کہ اللہ کا نام پہنچاتے گا۔اور یہ تو دیکھو کہ فضل علی خواجہ کے رُکھوں کے باڑے وسیع ہوتے اور گھر ان کے اونچے ہوتے کہ قریشیوں کے ناموں کے کھمبے بلند ہوتے۔

انھیں تو میرے کاموں سے بڑی بڑی عزّتیں، بڑی بڑی ناموریاں ملیں۔اور یہ قحط سالی تو میرے لیے ناموری لے کر آئی۔تو اب میں دلجمعی کے ساتھ اللہ کا نام میاں والی میں اور پھر پنجاب بھر میں پھیلاؤں گا اور لوگ تو اب میری سنیں گے کہ واہ درویش۔واہ درویش۔واہ درویش۔

اچانک ایک چمک کے ساتھ زانو پر دو ہتّڑ مار خواجہ فضل علی قریشی کھڑے

ہو گئے۔ گریبان میں ہاتھ ڈال خاکستری جامہ چاک کر ڈالا اور رات کے سناٹے میں بے آواز چیخے کہ او فضل! او ان گھڑے! او ان گھڑے! تو کالا باغ کے ٹبّوں ٹیلوں پر بیٹھے ہوتے گدھوں سے کچھ بہتر تو نہیں ہے۔ وہ بھی قحط سالی سے مسرور ہیں کہ شکم سیری کے لیے کھیتوں، گڑھوں، گلیاروں میں مردار جانوروں کا منوں گوشت موجود ہے اور خلق اللہ کی مصیبتوں پر ان کے بدنما شکم پھولتے جاتے ہیں۔ ارے تُو تو کندن بننے نکلا تھا پر رانگے کا رانگا ہی رہا۔ او طوطے، او گونگے، او رانگے، او کچے رانگے تو نے تو مجھے ہلاکت میں ڈال دیا۔

پھر سکون کی گہری نیند سوتے ہوئے عقیدت مندوں کے درمیان سے فضل علی سائے کی طرح نکلے اور باڑے کے باہر آ کھڑے ہوتے۔ کسی نے بیرونی کچّی دیوار پر گیرو گھول کر ٹیڑھے میڑھے حروف میں "ڈیرہ درویش حضرت خواجہ فضل علی قریشی روشن ضمیر، خلیفۂ ارشد حضرت بابا خواجہ سائیں سراج الدین دامانی" لکھ دیا تھا۔ شیخ کا نام نامی پڑھا، تڑپ کر دیوار سے جا لپٹے اور بابا سراج کے نام پر پیشانی ٹکا کر ہچکیاں لے لے کر اس طرح روتے کہ لگتا تھا سینہ شق ہو جائے گا۔

طبیعت کو کچھ قرار آیا تو دیوار کا لکھا ایک بار پھر پڑھا، ایک ٹھنڈے بے رحم طیش کے عالم میں "حضرت خواجہ فضل علی قریشی روشن ضمیر، خلیفۂ ارشد" کے الفاظ پر دونوں ہتھیلیاں تیمّم کے انداز میں ماریں اور چہرے پر مل لیں۔ دو ہتّڑ مارتے تو دیوار کا کچّا گیرو ہتھیلیوں پر چھوٹ آتا پھر اُسے اپنے چہرے پر مل لیتے اور زیرِ لب کہتے جاتے،

"لے خواجے لے ـــــ لے درویشے لے ـــــ لے روشن ضمیرے لے ـــــ لے خلیفے لے۔"

تو اس طرح اللہ نے ایک قیامت کی گھڑی میں انھیں سُرخ رُو کیا۔

خواجہ فضل علی دیوار سے ہٹے تو اب وہاں چمکیلے گیرو سے بس اتنا لکھا رہ گیا تھا کہ "ڈیرہ درویش حضرت بابا خواجہ سائیں سراج الدین دامانی"

اور خواجہ فضل علی باڑے کی دیوار سے ہٹے تو سیلاب سے ڈھے جانے والی دیوار کی طرح گھٹنوں پر ہتھیلیاں ٹکا کر بیچ گلیارے میں بیٹھ گئے۔

اندر باڑے میں قریب و دُور سے آنے والے ارادت مند اور کٹمب قبیلے والے اور بچپن لڑکپن کے دوست خشک سالی اور قحط کی سختیاں بھولے ہوتے چین کی نیند سوتے تھے اس لیے کہ ان کے حسابوں ایک رحمتِ باری خواجہ فضل علی درویش کی صورت میں جاگ رہی تھی۔ اُن کی فصلوں، اُن کے رزقوں پر ابرِ باراں کی طرح سایہ فگن تھی۔

تب خواجہ فضل نے باڑے کی طرف اور اپنی طرف دیکھا اونچی آواز میں بولے۔

"اے طوطے پڑھ۔ اور پڑھا کہ تمام موجودات پر سایۂ رحمت تو وہی ہے اور رحمت بھی وہی اور رحیم بھی وہی ہے کہ ارحم الراحمین بھی وہی ہے کہ سائے تو اس کے نور میں، اس کے نوروں اُجلے نور میں ایسے معدوم ہوئے جاتے ہیں کہ اللہ اللہ۔"

پھر خواجہ فضل علی آہستہ آہستہ باڑے کے دروازے کی طرف بڑھے، سادہ دِل ضرورت مندوں کی بے چارگی ایک بچکانہ حیرت کے ساتھ خواجہ فضل کا منہ تکتی تھی کہ دیہاتی چمرودھے جوتوں کا ایک بے ترتیب ڈھیر دروازے پر پڑا تھا۔ اُن میں کہیں کہیں شہروں سے خریدے ہوتے نئے طرز کے جوتے بھی تھے۔ کیونکہ روزگار اور کام دھندے کے لیے انگریز کی عملداری میں دُور دُور تک جانے والے نئے طرز کی

زندگی کو دھیرے دھیرے چھو کر دیکھ بھی رہے تھے۔

کھیتوں، کھلیانوں، بیڑوں کی مٹی جوتوں سے لپٹی ہوتی، میلوں سے چل کر آنے والوں کے ساتھ اڑتی ہوتی دھول جو ترٹختے ہوئے چمڑے کی دراڑوں میں جمی ہوئی۔ گھسے ہوتے پرانے چمڑے کے ریشوں اور پسینے سے تہہ بہ تہہ جمی ہوئی پپڑیوں سے بھاری گھتے اور طلّے کے کام کی نوکدار شوقین مزاجوں والے نوجوان زمینداروں کی نوکیلی جوتیاں اور لکڑی کی کھڑاویں اور مونجھ سے بنی ہوتی کھیڑیاں اور چپلیاں...

سو خواجہ فضل علی ان کے درمیان دوزانو بیٹھ گئے اور گریباں دریدہ کرتے سے ایک ٹکڑا اپھاڑ کر محبّت نرمی اور توجّہ کے ساتھ ایک ایک جوتے کو جھٹک جھاڑ پونچھ کر مٹی چھڑا چھڑا کر اپنے دامن کی اس دھجّی سے مقدور بھر چمکا کر اور جوڑیاں بنا بنا کر قطاروں میں رکھتے گئے۔

ایک میٹھی آسودگی کا دریا سینے سے بہتا ہوا بازوؤں میں اور ہتھیلیوں میں اور پور پور میں اور انگلیوں کے سروں سے گزر رہا تھا۔

تو کالا باغ کے ٹبوں، ٹیلوں، گُنجوں، پتنوں سے یہ رات اسی طرح گزری۔

گھڑی بھر کی رفاقت

مسافرت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب
گھوڑا اپنے سوار کی راسیں سنبھال لیتا ہے
(ایک طبع زاد کہاوت)

مسلسل دو دن اور دو راتیں گھوڑے کی پیٹھ پر گزاری تھیں۔ انتہا درجے کی تھکن اور تشویش میں سَنبَھل کا حاکم عیسٰی خان گکبُور سروانی بنگالے پہنچا تھا کہ سلطانِ ہند حضرت شیر شاہ سوری بنگالے میں صاحبِ فراش تھے۔

لکھنوتی کی شہر پناہ کے باہر قلعہ دار چنتامنی گوڑ ایک تازہ دم گھوڑا اور بعض اچھی خبریں لیے موجود تھا۔ سب سے اچھی خبر یہ تھی کہ سلطان شیر شاہ صحت یاب ہو رہے ہیں، اُنھوں نے بستر سے اُٹھ کر دالان میں ٹہلنا شروع کر دیا ہے۔ عیسٰی خاں اس شخص چنتامَنی کو دیکھ کر ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ قلعہ دار چنتامَنی بے ضرورت کلام اور سلام نہیں کرتا تھا اور اچھی اور مفید بات پہنچانے کے لیے ہر وقت تیّار رہتا تھا۔

عیسٰی خان نے اپنے رفیقوں کو قلعہ دار کی پُر تکلّف میزبانی کے حوالے کیا اور خود قلعہ دار کے بڑھائے ہوئے خوان سے ایک بڑا سُرخ سیب اُٹھا کر اُسے اپنے مضبوط دانتوں سے کاٹتا، گھوڑے کو ایڑ دیتا شہر میں داخل ہو گیا۔ لکھنوتی آتے ہوئے اُس کے ہمراہیوں میں سے کسی نے تجویز پیش کی تھی کہ اقامت گاہِ

سلطانی کے راستے میں کسی تُرک زادے کا حمّام ہے، اگر مسندِ عالی عیسٰی خان مناسب خیال فرمائیں تو ہم میں سے کوئی آگے بڑھ کر حمّام تیّار کرا دے۔ غسل کر کے تازہ دم ہو جائیے گا پھر اقامت گاہِ سلطانی تشریف لے جائیے۔ مگر عیسٰی خان نے انکار کر دیا۔ وہ پہلے اقامت گاہ سلطانی پہنچ کر خود صدر الصدور حسن علی خان یا خادمِ خاص شنادر غلزئی کی زبان سے یا اگر شہزادہ عادل خان سوری موجود ہوئے تو اُن کی زبان سے سلطانِ والا جاہ کی خیریت سُنے گا۔ غسل اور لباس کی تبدیلی اور کھانا پینا سب کچھ بعد میں ہو گا۔

سَنبھل کا حاکم مسندِ عالی عیسٰی خان ککبُور سروانی شیر شاہی دربار کا حُجّاب دار، میرِ توزک اور سلطان کا تنبول دار تھا۔ وہ سلطان کو دربار میں پان پیش کرتا تھا...... یہ خود اپنی جگہ ایک جلیل القدر اعزاز تھا۔ اُسے پانچ ہزار سواروں کی سالاری اور اہل و عیال کی پرورش کے لیے دو پرگنے عطا ہوئے تھے۔ عیسٰی خان بلا کا شمشیر زن اور قیامت شاہسوار تھا۔

عیسٰی خان کو سلطنت کے پہلے 'وکیل' یا وزیر کا رُتبہ ملا تھا جس کا وہ بجا طور پر اہل تھا۔ عزت مآب مہمانوں، سرداروں، والیوں، حاکموں، شاہوں کو رونمائی سلطان میں پیش کرنا، اُن کو اُن کے مراتب سے دربار میں کرسی، نشست اور اعزاز فراہم کرنا، بہ وقتِ ضرورت خلعت و انعام و سند مہیّا کرنا، عیسٰی خان کے فرائض میں شامل تھا۔ سلطان اور مملکت کا وفادار رہنا عیسٰی خان کے فرائض میں شامل تھا اور سلطان سے محبت کرنا بھی۔ مگر کسی سے محبّت کرنا کسی کے فرائض میں کیسے شامل ہو سکتا ہے؟ عیسٰی خان نے سُن رکھا تھا کہ محبّت کا درجہ فرض سے کہیں زیادہ رفیع اور محترم ہے۔

مگر عیسٰی خان حجّاب دار خود رفیع اور محترم تھا اور وہ اپنے بادشاہ سے

محبت کرتا تھا۔

شاید بہت دن تک درباروں سے وابستہ رہنے کی وجہ سے ایک کمزوری ضرور عیسیٰ خاں کے مزاج میں در آئی تھی۔ وہ محبت کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ جب سلطان کے لیے اُس کی محبت ظاہر ہو تو وہ ان کے مُلاحظے میں بھی آئے اُس کی تازگی و رعنائی ویرانے میں کھلتے پھول کی طرح ہَوا کا رزق نہ بن جائے۔

اِسی لیے لکھنوتی میں داخل ہوتے ہوئے وہ گرد و غبار اور تھکن اور تشویش میں اَٹا ہوا سیدھا اقامت گاہِ سلطانی جانا چاہتا تھا تاکہ شیر شاہ سوری کے قریب کے یہ تین آدمی، حسن علی خان، شنا در غلزئی اور شہزادہ عادل اُسے سلطان کی محبت میں پریشان مُو دیکھ لیں۔ یا اگر، خُدا اس کا خیال مبارک کرے، اگر سلطانِ والا جاہ کسی دریچے سے ایوان کے صحن میں نظر دوڑاتے ہوئے خود ملاحظہ کر لیں تو سبحان اللہ! اُس کا یہ تکلیف دہ طولانی سفر باثمر ہو جائے۔"

قلعہ دار چنتامَنی گوڑ نے یہ خبر بھی دی تھی کہ سلطان شیر شاہ نے فیصلہ کیا ہے کہ پرگنہ شاہ آباد کا گاؤں ناہ والی، جو تختِ دہلی پر بیٹھنے کے بعد سلطان نے خود عیسیٰ خان کو بے طلب بخش دیا تھا، اب عیسیٰ خان سے لے کر شہزادہ عادل خان کو عطا کیا جائے گا۔

یہ خبر سن کر عیسیٰ خان نے خود کو سمجھایا تھا کہ پنج ہزاری سالاری سنبھل سرکار کی حاکمی، حجّاب داری، تنبول داری، معتمدی اور سرداری کے ہوتے اور بال بچوں اور وابستگان کی پرورش کے لیے دو پرگنوں کی آمدنی کے موجود رہتے اِس ایک گاؤں کے سندِ جاگیر سے نکل جانے سے کون سی قیامت آجائے گی۔ نہیں، عیسیٰ خان کے مرتبے اور آمدنی میں ایک گاؤں کے چلے جانے سے کوئی کمی واقع نہ ہو گی۔ ہاں، احسان مندی کی ایک روایت جو شیر شاہ سوری نے

ہندوستان کا تخت سنبھالتے ہی قائم کرنا چاہی تھی۔ درمیان سے کٹ جائے گی، اور عیسیٰ خان جو شیر شاہی دربار کے دستور اور روایات کا پاسدار تھا۔ ایک روایت کے اِس طرح منقطع ہوجانے سے اُداس تھا۔

عیسیٰ خان بڑے باپ کا بیٹا تھا مگر یہ بات وہ کھُل کر نہیں کہہ سکتا تھا اِس لیے کہ شیر شاہ سُوری کے دربار میں اگر قبیلوں کے سرداروں کو شوکت اور عروج حاصل ہوا تھا تو خادموں خانہ زادوں کی اولاد بھی عالی مرتبت ہو گئی تھی اور وہ جو آبائی علاقے روہ میں حجُروں سے اُٹھتے وقت سرداروں، خانزادوں کی دستاریں دونوں ہاتھوں پہ رکھ کر اُنھیں پیش کرتے تھے اور بد ھنے بھر بھر کر اُنھیں وضو کراتے تھے اور اُن کے مرکبوں کی راسیں تھامے کھڑے رہتے تھے وہ آج قلمروِ ہند میں اُن کے برابر بیٹھتے ہیں اور واللہ! اُن کے قریب سے گھوڑا نکال لے جاتے ہیں۔ مسندِ عالی خواص خان کو دیکھو، سلطان کے خادم ملک سکھا کا بیٹا ہے۔ اللہ نے ..... اور سلطان نے ...... اِسے کیا دبدبہ و شکوہ عطا کیا ہے۔

یہ نہیں کہ میں کسی سے اِس کے عروج کی وجہ سے حسد کرتا ہوں۔ مجھے میرے خدا نے اور میرے بادشاہ نے بہت دے رکھا ہے۔ اور حسد وہ کرے جس نے شوکت و مرتبہ اِس نسل کے سوا کبھی دیکھا نہ ہو۔ میں خانِ اعظم عمر خاں ککبور سروانی کا بیٹا ہوں جسے شیر شاہ سے پہلے سلطان بہلول لودھی نے عزّت و شہرت اور خطاب و جاگیر سے نوازا تھا۔ وہ میرا باپ مسندِ عالی عمر خان ہی تو تھا جس نے فرید خان سُوری ..... اُس وقت سلطان شیر شاہ، فرید خان ہی تھے ...... تو فرید خان سُوری کے باپ میاں حسن خان کو شاہ آباد پرگنے کا یہ گاؤں ناہ والی جاگیر میں دیا تھا اور خود وہ میرا باپ خانِ اعظم عمر خان تھا جس نے بارہ سال کے

لڑکے فرید خاں کو اسی گاؤں میں بلھو نام کی مزرع عطا کی تھی اور کہا تھا کہ ابھی تُو نو عمر ہے جب اپنی عمر کو پہنچے گا تو تجھے ملازمت بھی دوں گا اور تُو کیوں کہ اس وقت اپنے باپ کے ساتھ آیا ہے اور ملازمت طلب کرتا ہے اس لیے تالیفِ قلب کے لیے بلھو کی یہ مزرع تجھے عطا کرتا ہوں اور چنتا منی گوڑ کہتا ہے کہ اب وہی گاؤں واپس لیا جا رہا ہے جو سلطانِ عادل شیر شاہ سوری نے تختِ دلّی پر متمکّن ہوتے وقت بے طلب مجھے۔ اپنے محسن اور بخشندہ کے بیٹے کو بخش دیا تھا تاکہ احسان مندی کی ایک روایت سوری خانوادے سے جاری ہو اور گکھور سروانیوں کو تا قیامِ قیامت یہ احساس گرم و سرشار رکھتے کہ ہم نے کبھی سوری حسن خان کو یہی ناہ والی گاؤں ازراہِ پرورش عطا کیا تھا کس لیے کہ جب سوری ضرورت مند تھے۔ پھر ایک احسان شناس سوری شیر شاہ نے وہ گاؤں عیسیٰ خاں گکھور سروانی کو جاگیر میں دے کر گویا احسان مندی کی ایک روایت کا آغاز کیا تھا اور افسوس وہ روایت اب منقطع ہونے کو ہے۔ قلعہ دار چنتا منی کہتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

اور یہاں قلعہ دار کے پیش کیے ہوئے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ عیسیٰ خان نے راسیں کھینچ لیں۔ گھوڑے سے اتر آیا اور رستہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ گھوڑے کی راسیں ڈھول میں گرائے ہوئے پختہ عمر کا ایک دبلا سردار سڑک کے کنارے سر جھکائے کھڑا ہے۔

پناہ بہ خدا! کیا یہ عیسیٰ خان تھا جو اتنی پست سوچ سوچتا ہوا چلا آ رہا تھا؟ یہ سنبھل کا حاکم، سوری دربار کا حجّاب دار، مملکت کا میرِ توزک، اپنے سلطان کا تنبول دار، کیا یہ پانچ ہزار شیر شاہی سواروں کا سالار ہے جو اتنی گراوٹ کے ساتھ، ایسی رسوا کن باتیں اور کم ظرف خیال پال رہا ہے؟ اور ناموس باختہ عورتوں کی طرح خیال ہی خیال میں اپنے رفیقوں پر طعنہ زنی کرتا اور منافقت

سوچتا چلا آتا ہے؟ نہیں! عمرُ خان جنّت مکانی کا بیٹا ایسی اُتھلی باتیں کیسے سوچ سکتا ہے۔

تف ہے مجھ پر۔ نفریں ہے مجھ سوار پر اور لعنت اِس نحوست آثار گھوڑے پر۔"

عیسٰی خان نے ایک ٹھنڈے غصّے میں لرزتے ہوئے زین کا تسمہ کھول کر، گھوڑے کا ساز اور زین اور زین پوش زمین پر گرا دیا اور اپنے نیام کو چوڑائی کے رُخ سے چابک کی طرح گھوڑے کے پٹھے پر مار کر اُسے بوجھ کھینچنے والے جانور کی طرح بازار کی طرف ہنکا دیا اور چیخ کر کہا: "تُف ہے تجھ پر! تیری سواری نے مجھے عیسٰی خان نہ رہنے دیا۔ او لعنتی جانور، تیری نصف ساعت کی رفاقت نے مجھے چوہے جیسا خود غرض اور کمینہ بنا دیا۔ تُف ہے تجھ پر!"

اور اِس طرح چنتامنی گوڑ کے پیش کیے ہوئے گھوڑے کو بے آبرو کر کے سڑک پر ہنکا دینے کے بعد، سنبھل کا حاکم عیسٰی خان گکبور سَروانی، گرد اور خِفّت میں اَٹا ہوا، خود اپنے احتساب سے نڈھال اقامت گاہِ سلطانی کی طرف پیادہ پا روانہ ہو گیا۔

❁

ملفوظاتِ بھپوتا

کسی کے بزرگوں، علی الخصوص والد کے منہ بولے چچا کی جسمانی موت پر کھلکھلا کر
ہنسنا بڑی ذلیل بات ہے۔ مگر یہ بات اپنے سیاق و سباق میں ہی اچھی لگے
گی اس لیے ابتداء سے عرض کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سو عرض کرتا ہوں۔
یہ اس زمانے کی بات ہے جب آنجہانی اڈولف ہٹلر کی فولاد اور کانکریٹ
سے کھینچی ہوئی سیگفریڈ لائن تاش کے پتوں کے مانند بکھرنے والی تھی۔ لُفت وافے
کے باجبروت طیارے تھکے ماندے بُریدہ پَر گِدھوں کی طرح وسطی یورپ کی روندی
ہوئی زمینوں پر ایک ایک کر کے ڈھے رہے تھے، اتحادیوں کا ریلا رُوہر پر
ستک دے رہا تھا اور بقول شخصے آخری جنگِ عظیم اپنی انتہا کو پہنچ کر لوٹنے
والی تھی، کہ یہ گنہگار نیکر پہنے ورنا کیولر مڈل اسکول بانسواڑا کے سامنے سے گزرا۔
ڈرل ماسٹر استاد وینکٹا ناتھن دِویدی، بیکنٹھ مکانی اسکول کے پھاٹک سے
ٹیک لگائے دتوان کر رہے تھے۔ مجھے نیکر پہنے گزرتے ہوتے دیکھ کر انھوں
نے تبسم فرمایا، اپنی ران پر تھپکی دی اور دانت پر دانت جما کر بولے کہ ”ہونہار برِوا
کے چکنے چکنے پات“۔ یہیں سے میری شعری زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔
آنجہانی وینکٹا ناتھن دِویدی صغر سنی (میری صغر سنی) سے ہی مجھ
خاکسار پر توجہ فرمانے لگے تھے۔ مُتبحّرِ عالم تھے، اُن کے دادا چَتُر ویدی، باپ

SIEGFRIED LINE | LUFT-WAFFE | RUHR

ترِی دیدی اور پھوپا دِویدی تھے ۔ پھوپی کی خواہش تھی کہ بھتیجے وینکٹا ناتھن بھی کم سے کم پھوپا جیتنی نِگم وِدیّا پراپت کرلیں ۔ اس لیے اُس نیک خاتون نے انھیں بچپن ہی سے چھوٹے دِویدی جی کہہ کر پکارنا شروع کر دیا تھا۔ مگر میرے استاد کہ تلمیذ اَسفل السافلین تھے، ویدوں پرانوں کا علم کسی کسبی یا وَہبی حوالے سے کس طرح قبول کر لیتے انھوں نے ایک روز پھوپا دِویدی کے سر پر چھاچھ کی گاگر الٹ دی اور مغلّظات سناتے بھاگ کھڑے ہوتے ۔

اُن دنوں بانسواڑا چھاوَنی میں زور و شور سے بھرتی ہو رہی تھی۔ استادِ محترم نے چھاوَنی کی راہ لی، موٹّپلا کوارٹر ماسٹر حوالدار کو چپّل پہنے پہنے فوجی سلیوٹ پھٹکارا۔ موٹّپلا مسکرایا۔ اُس نے استاد کے دانت دیکھے، قد اور سینے کی پیمائش کی، اسپرنگ والی مشین پر اُن کا وزن کیا اور پنڈت ہوتے کے ناتے انھیں لانگریوں میں ہیلپر ریکروٹ کے عُہدۂ جلیلہ پر بھرتی کر لیا۔

سترہ برس سرکارِ انگلشیہ کی خدمت کرتے ہوئے عہدۂ لانس نائک تک ترقیاں پائی تھیں، استادِ مکرّم باعزّت ریٹائر بھی ہو جاتے اور تاحیات پنشن بھی پاتے اگر مَیس حوالدار سُبرامَنیم کی خباثت آڑے نہ آجاتی ۔ اُس قرمُساق نے استادِ معظم کو سرکاری بطخوں کے انڈوں میں خیانت کا ارتکاب کرتے ہوئے بالآخر دھر ہی لیا۔ کورٹ آف انکوائری بٹھا دیا گیا اور کیونکہ کرنل کمانڈانٹ کے رو برو مسروقہ انڈے اُستاد کے برانڈ کوٹ کی جیبوں سے برآمد ہوئے تھے، انگریز کا زمانہ تھا اس لیے کھڑے کھڑے چھاوُنی بدر کر دیے گئے ۔ بدنہادوں نے اُستاد کو بانسواڑا کینٹ گارڈ روم کے بڑے پھاٹک سے بہ ایں ہیئتِ مجموعی دوڑا لیا کہ اُستادِ مکرّم کے جسم پر ایک کچھّا اور سینڈو بنیان تھی یا جنیؤ کا کچّا دھاگا جو اُس مردود سبرامنیم نے استاد کے کان سے لپیٹ دیا تھا۔ خبیثوں نے سرکاری کریپ

سول جوتے تک اتروا لیے تھے۔

خوش قسمتی سے اُن دنوں بانسواڑا ورناکیولر مڈل اسکول میں ڈرل ماسٹر کی آسامی خالی تھی، آنجہانی دینکٹا ناتھن جی دِویدی مناسب کپڑے پہن کر قواعد پریڈ کرتے ہوئے اسکول میں اور پھر اس خاکسار کی شعری زندگی میں دَر آئے۔

اردو، ہندی، موپلاتی، ٹامل، کنٹری، ملیالم، انگریزی اور عربی گویا نو زبانیں قواعدِ پریڈ اور بھارت ناٹیم میں نے استاد دِویدی سے سیکھے۔ ہر چند کہ انگریزی اور عربی میں ترتیب وار فرانسس ڈی ژور و صاحب (دکہ کرنل کمانڈانٹ کے آبدار تھے) اور پانچویں موپلا ریجی منٹ کے ایک چاؤش لانس دفعدار (نام جن کا اب ذہن سے نکل گیا ہے) میرے بنیادی استاد رہے۔

استاد دِویدی استادوں کی اُس نسل سے تھے جو اَب ناپید ہے (اور پہلے بھی نایاب تھی) آنجہانی نے مُنہ کھول کر کبھی مُنہ سے کچھ طلب نہ کیا، جب جو سمجھ میں آیا اور جتنا بن پڑا اُٹھالیا۔ اپنی اس اصول پرستی کے ہاتھوں جب تک جیے اور جس حد تک جیے معاشرتی اور قانونی مشکلات کا شکار رہے۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ ایک بار علاقہ مدھیہ پردیش کی سیر کو تشریف لے گئے۔ ایک روز کھجُراؤ کے مندر کی دیواروں پر تراشے ہوئے سینکڑوں برس پرانے مُتھن کے ہیجان خیز نقش دیکھتے ہوئے بعالم استغراق اسمتنا بالید فرماتے تھے کہ پکڑے گئے۔ عیاذاً باللہ! کیا آدمی تھے!

بیس دن کی جیل کاٹ کر واپس آئے تو دنیا تیاگ دی، سنّیاس لے لیا۔ تاہم تقسیم ہند سے سترہ روز پہلے کالپی کے جنگل میں ایک مادہ ہرن کو دیکھا، قابو کیا، قابلِ دشنام روّیہ اختیار کیا۔ پھر پکڑے گئے۔ انجمنِ انسدادِ بے رحمی بر حیوانات کے کسی بدنہاد انسپکٹر نے چالان کر دیا۔ مقامی ویٹرنیری نے ان کا اور ہرن کا طبّی معائنہ کیا۔ انگریز کا زمانہ ابھی سترہ دن باقی تھا۔ الزام درست ثابت ہونے پر استاد کو پھر بیس روز

قیدِ بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ یہ رہا ہوئے تو ملک آزاد تھا استاد محترم کے یہ بیس روز گویا ان کی زندگی میں ایک اور انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتے۔ جیل سے باہر آکر سنیاس ترک کیا اور رائے پور کے سینٹرل سنیما کے باہر لیمن سوڈے کی بوتلوں کا اسٹال لگا لیا۔ فلم اسٹار مادھوری کے عشق میں مبتلا ہوتے اور بوتلوں کے ڈھکنے کھولتے کھولتے ایک دن آخری شو کے بعد داعیِ اجل کو لبیک کہا ؎

حیف در چشمِ زدن ....

اس عاصی نے اپنا پہلا شعری مجموعہ "وینکٹادرشن" استاد کو شردھا نجلی بھینٹ کیا تھا۔ دوسرے مجموعے کا نام "چھاچھ کی لٹیا" بھی استاد وینکٹا جی کی زندگی کے اہم واقعے سے متاثر ہو کر رکھا گیا ہے۔ خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔

یادش بخیر۔ بانسواڑے سے ڈھائی تین کوس پر ایک قدیم شیوآلئے تھا۔ کبھی چھٹے چھ ماہے کوئی مہنت پجاری مندر کا صحن بہار نے، دیوا ستھان کو جل پر و سنے، سندور چندن دینے آنکلتا یا پھر کوئی بھولا بھٹکا پینڈو، ڈنڈوت کرتا، ناریل چڑھاتا ایک دروازے سے داخل ہوتا دوسری راہ نکل جاتا۔ غرض کہ عجب پرہول جگہ تھی۔ دیو استھان پر کردِ تاندِھان، اُما کانت، سچن آنند، نٹ ور، گریجا پتی شنکر کی اُجوّل آکرتی تھی اور سرخ پتھروں والے صحن کے بیچوں بیچ کوئی سولھے فیٹ پاٹ کی سنگین یونی پر اٹھائیس فیٹ کا لنگم نصب تھا کہ سخت ہیبت و جلال کا مقام تھا۔ ایک بار بانسواڑا ورناکیولر مڈل اسکول کے اساتذہ اور شاگردوں کا جتھا پکنک مناتے نکلا تو شریر لمڈوں کی ایک ٹولی شیوآلئے میں جا گھسی۔ پورے ضلعے میں ایک ہمیں ہی مسلمان طالب علم تھا (ضلع کی مسلمان اکثریت نداقی اور کفش دوزی سے شغف رکھتی تھی، حصولِ علم کا کوئی خاص شوق نہیں تھا)

ہر چند کہ بزرگوں نے ہر مسلک، ہر دھرم کا احترام کرنا سکھایا تھا مگر اخر کو میں

نٹ کھٹ تھا ایک عجب طرح کی للک اٹھی کہ مجھ ناہنجار سے اٹھائیس فیٹ کا یہ لنگم دیکھا نہ گیا، جوتے اتار یونی پر چڑھ گیا۔ جیب سے رنگین چاک نکالی اور شیولنگ پر اردو میں "عید مبارک" لکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ہائے ہائے کیسے لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ ریاضی کے استاد آنجہانی پرشوتم رائے گوالکر جی، بیکنٹھ نواشی نے، کہ اردو سے نابلد تھے، یہ تصوّر کرتے ہوئے کہ میں ناہنجار عقیدت و احترام کے حرف لکھنے یونی پر چڑھا ہوں۔ تبسّم فرمایا اور بولے کہ اگر زندہ بچ گیا تو یہ مسلمان لڑکا دوسرا ملک محمد جائسی بنے گا اور ایک نئی پدماوت لکھے گا۔ بحمد للہ استاد گوالکر کی یہ مشروط پیش گوئی لفظ بہ لفظ پوری ہوئی، اسی لیے میں خاکسار اپنا دوسرا مجموعۂ کلام بھی کہ بفیضِ ربّی پہلے مجموعے کے بعد پدماوتِ ثالث کا درجہ رکھتا ہے، حاضرِ خدمت کر چکا ہوں۔

میرے دوسرے اُستاد جن کے فیضِ صحبت سے مجھے علمِ عروض کا درک ہوا یہی آنجہانی گوالکر جی تھے، یہ پشتینی پیشے کے اعتبار سے ورق گر تھے۔ بعد کو ریاضی داں ہوئے۔ اپنے دورِ شباب میں چاندی کے ورق کوٹتے ہوئے موصوف نے موگریوں کی ضربوں میں اپنے اندر کا آہنگ خود ہی دریافت کیا تھا کہ خبر نہیں صوفیاء کی سنگت میں ورق نقرہ پر والہانہ رقص فرمایا تھا، مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ اسکول کے سالانہ جلسے میں جب میں استاد اسمٰعیل میرٹھی کی شہرۂ آفاق نظم "پن چکّی" پڑھنے کھڑا ہوا تو پہلے ہی شعر کا دوسرا مصرعہ بھول گیا۔ سات بار لحن بدل بدل کر پہلے ہی مصرعے کو پڑھ چکا تب بھی مصرعہ ثانی یاد نہ آیا تو پریشانی لاحق ہوئی۔ یہ البتہ دماغ میں رہ گیا تھا کہ "چکّی" کا قافیہ "پکّی" ہے سو آٹھویں بار "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق میں نے شعر پڑھ دیا کہ ؎

نہر پہ چل رہی ہے پن چکّی
دَھم دھما دَھم دھمام کی پکّی

اور سلام کر کے ڈائس سے اتر آیا۔ ابھی اپنی نشست تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ "ہرے ہرے ہرے رام" کا نعرہ مار شفیق اُستاد پرشوتم رائے گوالکر جی نے دبوچ لیا۔ اللہ اللہ، بیکنٹھ نواسی اُستاد روتے جاتے تھے، میرا منھ چومتے جاتے تھے اور بار بار فرماتے تھے کہ "تاہر و بینگل گھنٹر و جبر بائیں۔ تاہر و بینگل گھنٹر و جبر بائیں" بعد کو معلوم ہوا کہ موصوف میرے علمِ عروض کی تعریف فرماتے تھے۔

اُستادِ معظم شری گوالکر جی کسی زمانے میں شعر بھی کہتے تھے اور ورق گری کی نسبت سے موگری تخلص کرتے تھے۔ عقیدے کے حساب سے دگمبر جینی تھے سو فطرت سے ازحد قریب رہنا پسند فرماتے تھے۔ اسکول سے گھر پہنچتے ہی الف ننگے ہو جاتے اور دوسرے دن اسکول جانے تک اسی حالت میں رہتے۔ کیسے لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ برہنگیٔ استاد کے باوجود کیا مجال تھی جو اُن کے اس عمل سے کوئی سماجی مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ مسئلہ پیدا نہ ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ استادِ مکرم گوالکر جی کا کبرسنی کا دور تھا کوئی اسی کے پیٹے میں ہوں گے۔ علاوہ ازیں ایک رسوئیے اور جھاڑو بہارو والی عورت کے سوا دوسرا کوئی اُن کے گھر آتا بھی نہ تھا اور یہ دونوں بھی ڈیپ سی ڈائیونگ یعنی غوطہ خوری کے تقریباً آہنی لباس میں سیاہ اوپیک چشمے پہن کر گھر میں داخل ہوتے تھے اور جتنی دیر خانۂ استاد میں رہتے یہی لباس اور یہی چشمے استعمال کرتے تھے۔ شری گوالکر جی موگری خدا کے فضل سے صرف بانسواڑے میں کوئی اکّا دن برس گھر آنگن میں ننگے ٹہلتے اور علم و فضل پھیلاتے رہے۔ آخری عمر میں سَلسِ بَول کی شکایت ہو گئی تھی۔ دسمبر کی ایک رات میں کسی وقت پیشاب پینے اُٹھے اور حقیقتِ اولیٰ سے جا ملے۔ مادر زاد ننگے آئے تھے، مادر زاد ننگے روانہ ہوئے ؎

اُس رند کی بھی رات کٹی جو کہ عور تھا

درتاکیولہ مڈل اسکول بانسواڑا اور خود بانسواڑا چھاؤنی علم و ادب کے وہ روشن مراکز تھے جہاں اوّل اوّل شعرگوئی کی میری فطری صلاحیتیں صیقل ہوئیں اور اردو، ہندی، مراٹھی، ملیالم، کنڑی، موپلاتی، تامل وغیرہ کے زبان و بیان، اِملے، روزمرّے، محاورے، ضلع جگت اور اَبے تَبے رواں ہو گئے۔ پھر خاندان کے بزرگوں کی حوصلہ افزائیاں اُس پر مستزاد۔ ہر چند کہ یہ عاصی گھر کی مُرغی تھا مگر بانسواڑے اور نواحِ بانسواڑہ کے دوسرے سخن بچّوں کے بَرخلاف خوش نصیب تھا۔ بِلّٰہ الحمد، اس گھر کی مُرغی کو کبھی دال برابر نہ بننے دیا گیا۔ جس کے لیے یہ مُرغی خاندان کے بڑوں کی ممنون ہے۔ اللہ ایسا خاندان اور ایسی مرغی ہر ایک کو نصیب کرے۔ آمین۔

کامٹی کے ملک الشعراء شیخ ضمیر الحسن بَبّا کامٹوی رشتے میں میرے خالو ہوتے تھے۔ بانسواڑے میں اُن کا سال بسال ورُود گویا ضلع بھر کے سخن سنجوں اور سخن فہموں کے لیے ابرِ رحمت کی آمد کے مصداق ہوتا۔ وہ وہ مشاعرے بَرپا ہوتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ حضرت بَبّا صاحب کامٹوی کا یہ دستورِ خاص تھا اور مراعاتِ ملک الشعرائی میں یہ بات شامل تھی کہ مشاعرے کے آغاز و اختتام پر اور مشاعرے کے دوران بھی دو چار چھ بار، جہاں جہاں بَبّا صاحب مناسب سمجھتے اُنھیں زحمتِ کلام دی جاتی تھی۔ کسی کو دَم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ بھلے دن تھے۔ ضلع کے لوگ متواضع اور عالی ظرف تھے پھر فصل کاٹ لینے اور کھلیان بڑھا دینے کے بعد علاقے کے لوگوں کو کام بھی کیا ہوتے۔ اُن دنوں راتیں ویسے ہی بیکار جاتی تھیں۔ نداقی اور کفش دوزی کا باریک کام لالٹینوں اور ڈبیوں کی مدھم روشنی میں تو ہونے سے رہا اس لیے خلد آشیانی بَبّا صاحب کو دی جانے والی مراعات کو بہت ہی کم موقعوں پر چیلنج کیا گیا اور بات معمولی

لاٹھی پونگے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یہ اکّا دُکّا واقعات بھی علاقے میں حضرت بنّا کے چند بدانجام ہمعصروں کے گھُس آنے کی وجہ سے ہوئے۔ میں تو اسے علم و ادب کی خوش نصیبی ہی کہوں گا کہ یہ وہی زمانہ تھا جب بنّا صاحب کے برادرِ خورد محکمۂ مالگزاری میں واصل باقی نویس تھے۔ وہ بفضلِ تعالیٰ بااثر آدمی تھے۔ چنانچہ ہر سال مشاعرے کے زمانے میں حفظِ ماتقدّم کے طور پر گردو پیش کے بارہ پندرہ تھانوں سے مسلح کنسٹبلان طلب کر لیتے۔ محکمۂ مالگزاری کے چوبدار، پٹّے والے، محرّر، دفتری، جریب بردار تو ہمہ وقت موجود ہی رہتے تھے۔ یہ ساری نفری مشاعرہ گاہ کو گھیرے میں لے لیتی اور مشاعرہ ختم ہونے سے قبل کسی کو اٹھنے نہیں دیتی تھی۔ مشاعرے نہایت پُرسکون اور پاکیزہ ماحول میں ہوا کرتے۔ ہر شب اکثر و بیشتر بنّا صاحب عفرلہ، کا ہی کلام سماعت کیا جاتا تھا اور دوسرے فضول گو تک بندوں کی تگ و تاز سے ضلعے بھر کی سماعت و سخن فہمی محفوظ و مامون رہتی تھی اِک بنّا کا ہی طوطی بولتا تھا۔ میرے لیے مشاعروں کی یہ راتیں گویا دُعائیں مستجاب ہونے کی راتیں ہوتی تھیں۔ حق مغفرت کرے۔ خلد آشیانی بنّا خالو جب بھی بانسواڑے تشریف لاتے مجیروں کی ایک فاضل جوڑی اپنے سامان میں باندھ لاتے۔ مشاعرے کی تاریخ سے تین شب و روز پیشتر جناب خُلد آشیانی اور یہ گنہگار ریہرسل شروع کر دیتے اور مجیروں کے کھناکوں سے بانسواڑا صدر، بستی کلاں اور مضافاتِ بانسواڑا کھنکھنا اُٹھتے۔ دراصل بنّا صاحب کا طرزِ شعر خوانی تمام اگلوں پچھلوں سے مختلف اور منفرد تھا۔ مطلعے سے مقطعے تک شعر خوانی کرتے ہوئے حضرت بنّا صاحب بحر کے آہنگ پر اپنے مجیرے کھنکھناتے رہتے تھے۔ دجو ظاہر ہے ملک الشعرائی کے حساب سے خاصے بڑے اور وزنی تھے، عجب سماں بندھتا تھا۔ یہ خاکسار ڈائس سے اُتر کر حاضرین میں داخل ہو جاتا

اور گھُل مِل جاتا اور بیّا صاحب کی ردِم سُنتا ہوا یہ عاصی اپنے چھوٹے مجیروں کی جوڑی سے اس طور سنگت دیتا کہ حاضرین کی ایک ایک قطار میں گردش کرتا ہوا بیّا صاحب کی غزل کو مطلعے سے مقطعے تک پہنچا تا۔ آج کی زبان میں یوں سمجھیے کہ اسٹیریو کا لطف آتا ہوگا۔ کبھی کوئی باہر کا آدمی انجانے پن میں میرے کُرتے کی جیب میں دوانّی، چوانّی بھی ڈال دیتا مگر کیونکہ یہ عمل غیر کفو پر دلیسیوں، رہگیروں اور تلنگوں وغیرہ کی طرف سے معصومیت میں سرزد ہوتا تھا اور دینے والے کی نیّت نیک ہوتی تھی اس لیے اس عاصی نے کبھی اسے عزّتِ نفس کا مسئلہ نہیں بننے دیا۔ جو کچھ جس نے دیا ازراہِ استغنا جیب ہی میں پڑا رہنے دیا۔ اور خاموشی اختیار کی، ورنہ ممکن تھا کہ یہ بات بیّا صاحب عفرلہٗ کے علم میں آجاتی وہ خدا معلوم کیا اُدھم مچاتے۔ گمان غالب ہے کہ مجھ خاکسار سے یہ سکّے لے کر اپنے تصرّف میں لاتے۔ یہ بات بہر نوع کامٹی کے مَلِک الشعراء کے لیے کسی طور مناسب نہ ہوتی۔ بہر صورت جو بھی ہو، اللہ دلوں کے بھید جاننے والا ہے۔

ہمعصروں کے علاوہ بعض سخن ناآشنا کج فہم لوگوں نے جن میں خاندان کے چند بڑی عمروں کے مصلحت ناشناس لفنگے بھی شامل تھے حضرت بیّا کے طرزِ شعر خوانی پر اور اس عاصی کی پر بھات پھیری پر نکتہ چینی بھی کی اور کہا کہ شاعر کے لیے اپنا کلام مجیروں کی سنگت میں نذرِ حاضرین کرنا معیوب ہے اور ایک نوعمر لڑکے کو مثلِ بچّہ جمورا کے حاضرین میں کھڑتالیں اور مِجیرے کھڑکانے کے لیے بھیج دینا سفلہ پن ہے اور چیاں ہے اور چُنیں ہے مگر بیّا عفرلہٗ جانتے تھے کہ ہر اجتہاد کرنے والے کو، بٹی ہوئی روش سے ہٹ کر چلنے والے ہر مُجدّد کو ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ انھوں نے دور اندیشی سے کام لیا اپنی وضع نہ چھوڑی اور معترضین میں سے بعض کو سمجھا بجھا کر یا ڈرا دھمکا کر، خوشامد

درآمد سے یا پیسہ کوڑی سے امداد بہم پہنچا کر اور چند کو افرادی قوّت استعمال کر کے
شر انگیزی سے باز رکھا۔ بیّا صاحب کی یہ نو طرزِ شعر خوانی بالآخر قبولیّت عام
حاصل کر کے رہی۔ یہ عاصی اسی طرزِ نو ایجاد پر آج تک عمل پیرا ہے۔ اُس بزرگ
کی عطا کردہ مجیروں کی جوڑی آج بھی اس گنہگار کی بیاضوں کے متصّل دَھری
رہتی ہے اور وقتاً فوقتاً کام آتی ہے کہ تحفۂ درویش ہے۔ اللہ تعالیٰ ملک الشعرا،
شیخ ضمیر الحسن بیّا کو اجرِ عظیم دے اور مرقدِ بیّا کو کھنکھناتے ہوئے نور سے بھر دے۔

خاندان کے دوسرے بزرگ جنھوں نے اس ہیچمداں کو اپنے کنزِ علم کے
لعل و جواہر سے نوازا تاؤ شجاع الدین رنجیدہ تھے جنھیں اس خاکسار کے پدرِ محترم
پیار سے بھاتی افسوس کہہ کر پکارتے تھے۔ عوام الناس میں یہ "رنجیدہ ڈپٹی" کے
نام سے پہچانے جاتے تھے، کِس لیے کہ تاؤ مرحوم ڈپٹی کنزرویٹر فارسٹ تھے اور
محکمہ جاتی فرائض کی بجا آوری کے دَوران ہلاک ہو گئے تھے۔ محکمے کے ناظمِ اعلیٰ
مسٹر ایبرناتھی پائن وُڈ نے سرکارِ والا تبار سے اُن کے لیے حُسنِ کارکردگی کے
تمغۂ درجہ اوّل کی سفارش کی تھی۔ حُسنِ کارکردگی کا یہ تمغہ مل بھی جاتا مگر اُن کے
برادرِ نسبتی نے جو وقتِ ہلاکت موقع پر موجود تھا اور تاؤ رنجیدہ سے مخاصمت
رکھتا تھا محکمہ جاتی تفتیش کے دَوران سِفلے پن کا مظاہرہ کیا اور اپنے بیان میں
دو اور گواہوں کی شہادتوں کے ساتھ یہ درج کرا دیا کہ شیر نے جس وقت تاؤ غفرلہٗ
پر حملہ کیا اس وقت وہ (تاؤ) کھروندوں کی جھاڑی کے عقب میں حوائجِ ضروری
سے فارغ ہو رہے تھے۔ حکومتِ وقت تاؤ رنجیدہ کے حوائجِ ضروری کو یقیناً
نظر انداز کر دیتی مگر محکمے کی دستاویزات اور روزنامچوں کی جانچ پڑتال کے
دوران یہ انکشاف ہوا کہ وقوعے کے روز تاؤ شجاع الدین جنّت مکانی کو جائے حادثہ
سے ساڑھے گیارہ سو میل دُور ولایت کمایوں میں کسی خدائی خوار رینج پوسٹ کا

معائنہ کرنا تھا جس کے لیے مرحوم نے خود اپنے قلم سے روانگی درج کی تھی۔ ٹی اے
وغیرہ کا چالان بھرا تھا اور رقم وصول کی تھی۔ چنانچہ کورٹ آف انکوائری بیٹھ گیا۔
خاندان کے بڑوں نے مسٹر پائن وُڈ تک سفارشیں پہنچائیں۔ یہاں تک کہا
کہ ٹی اے کی رقم جو دو سو اڑسٹھ روپے کچھ آنے بنتی تھی تاؤ کے ورثاء سے لے
کر خزانۂ عامرہ میں جمع کرادی جاتے گی مگر پائن وُڈ خبیث نے ایک نہ سُنی۔
بہ مشکل تاؤ کے خلاف تادیبی کارروائی بعد از مرگ رکوائی گئی۔ جس کی سفارش
کورٹ آف انکوائری نے کی تھی۔ پھر بھی اس ملعون مُشرک نے تاؤ کی فائل پر
سوگ کا سیاہ حاشیہ بنا کر لکھا کہ "ایکس، ڈی، سی، ایف، دی لیٹ ایس یو
رنجیدہ جغرافیے کا مجرم ہے اُسے موجودہ جاتے حادثہ پر نہیں بلکہ یہاں سے
ساڑھے گیارہ سو میل دُور ولایت کمائیوں کی رینج پوسٹ نمبری ایک سو اُنتالیس
کی کسی مقامی جھاڑی کے عقب میں حوائجِ ضروری سے فارغ ہوتا تھا۔ پھر اگر وہ
زندہ بچ جاتا تو دو سو اڑسٹھ روپے اتنے آنے کا حقدار ٹھہرتا اور مرجاتا تو
تمغۂ حسنِ کارکردگی درجہ اوّل پاتا۔ یا قسمت یا نصیب"۔

تاؤ رنجیدہ انگریزی زبان پر جیسا عبور رکھتے تھے اس کے بیان کے لیے
ایک الگ دفتر درکار ہے۔ مختصراً عرض کردوں کہ اُن کے حکام جو بیشتر انگریزی
نسل سے تھے (جن میں وہ ملعون پائن وُڈ بھی شامل تھا کہ جس کا اُوپر ذکر ہوا ہے)
اپنے اکثر مسوّدات نظرثانی اور تصحیح کے لیے تاؤ رنجیدہ کے پاس بھجوایا کرتے
تھے۔ اہلِ شماتت نے اُڑا رکھا تھا کہ یہ مراسلے جو رنجیدہ ڈپٹی کو انگریزوں سے
ملا کرتے تھے دراصل جواب طلبی یعنی شو کاز کے نوٹس ہوتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔
بہر حال اُن کی عربی اور فارسی دانی کا شہرہ چار دانگ عالم میں تھا کہ نجد و فارس
سے متبحرِ علماء و فضلاء و مجتہدین زرِ کثیر صرف کر کے عربی و فارسی صرف و نحو

کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے جبلپور، بانسواڑے، کٹنی، راتے پور، ساگر غرض جہاں جہاں تاؤ جنّت مکانی کا قیام ہوتا آیا کرتے تھے اور تاؤ کے لسانی اجتہاد سے کہ جو کبھی کبھی لسانی فساد پر مُنتج ہوتا فیض اُٹھاتے تھے۔ تاؤ غفرلہٗ کو اللہ نے سوز و گداز سے مملو آواز دی تھی۔ اس پر اُن کا بتا بتا کر پڑھنا گویا سونے پر سہاگے کا کام کرتا تھا۔ ترنّم کے ساتھ "مامقیمانِ کوئے دلداریم" سُناتے تو مصرعے کی تصویر بن جاتے۔ اُن کے ماموں اور میرے رشتے کے دادا شیخ عبدالجمیل محنّت گسمنڈوی چیچک رُو تھے اور راتے پور میں دلدار حسین قصّاب کی گلی میں ایک تنازع میں مجروح ہو کر فوت ہو گئے تھے۔ تاؤ رنجیدہ کو اُن کی عبرت ناک موت کا صدمہ تاعمر رہا۔ اکثر دادا عبدالجمیل محنّت کو یاد کرتے تھے۔ اِن گنہگار آنکھوں نے یہ سماں دیکھا ہے کہ تاؤ رنجیدہ ترنّم کے ساتھ "مامقیمانِ کوئے دلداریم" پڑھتے اور اشاروں سے مصرعے کی شرح کرتے جاتے۔ عجب منظر ہوتا۔ تاؤ مغفور بھیروں ٹھاٹھ کی کسی راگنی میں ارشاد فرماتے "ماآآ آموں ں ں" اور اپنے چہرے پر تیزی سے اُنگلی مار مار کر گویا چیچک کے نشانات کا اشارہ کرتے یعنی اپنے ماموں (اور میرے دادا) عبدالجمیل محنّت کا سوانگ بھرتے پھر سیدھے ہاتھ کو دلدار حسین قصّاب کے بُغدے کی طرح تول کر تیزی سے دادا عبدالجمیل کا قیمہ بناتے اور رقّت کے ساتھ فرماتے "ماموں قیمہ" پھر ہم پر گویا زخمی ہو کر گر پڑتے اور ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے بار بار کہتے "نکوتے دلداریم۔ نکوتے دلداریم" آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور بھیروں ٹھاٹھ کی اُسی راگنی میں لیٹے لیٹے بار بار مصرعے کی تکرار فرماتے رہتے کہ "ماموں قیمہ نکوتے دلداریم۔ مامقیمانِ کوتے دلداریم" اللہ بس باقی ہوس۔

تاؤ شجاع مرحوم کے بیان کو بھی ایک دفتر چاہیئے۔ مختصراً عرض کرتا

ہوں کہ بے عدیل بزرگ تھے کسرِ نفسی کا یہ عالم تھا کہ اپنے تبحّرِ علمی کو تبخترِ علمی کہتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے "میں ہیچ میدان اپنے پرانے بڑے بڑے اکابرینِ سَلَف سے استفادہ حاصل کرتا ہوں۔ میرے پاس میرا اپنا کیا ہے گھر کی مُرغی دال مساوی" سو یہی میں گناہ گار وحید العصر ہیچ بھی عرض کرتا ہوں اور اپنے ملفوظات کا پہلا دفتر اختتام کو پہنچاتے ہوئے وہی اگلی بات پھر دُہراتا ہوں کہ کسی کے بزرگوں، علی الخصوص والد کے منہ بولے چچا کی جسمانی موت پر کِھلکھلا کر ہنسنا بڑی ذلیل بات ہے۔ مگر اس بیان کی وضاحت کا اب موقع نہیں رہا۔ بشرطِ زندگی پھر کبھی عرض کروں گا۔ وما توفیقی اِلّا باللہ۔

ڈزنگ ایک مکالمہ

+ تم ویلڈنگ یا خراد کا کام کیوں نہیں سیکھ لیتے ؟
○ قزاقِ اجل کا لوٹے ہے
+ سوچنے کو تو کوئی منع نہیں کرتا
○ ہر آن بجا کر نقارہ ۔
+ سوچنا بے انگ بھی ہو سکتا ہے ۔
○ (استفہام، تو کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر؟ اور بدھیا، بھینسا، بیل، شتر؟
اور بیل شتر؟
+ یہ کب کہتا ہوں ۔ مگر بائی تھنکنگ ۔
○ (استفہام، کیا ہاتھی لال عماری کے ۔؟
+ نہیں تو ——— مگر اتنا جانتا ہوں سوچنا بے انگ بھی ہو سکتا ہے ۔
○ (اثبات، یا گونی پلّا، سر بھارا ——— دونوں
+ کچھ بھی ہو بے انگ ہونا چاہیے ۔
○ ہاں بے انگ ہونا چاہیے ۔
+ تو پھر بزد کا چلاؤ ۔
○ (خاموشی)
+ یہ صدی ختم ہونے کو آئی ایک اچھا سا بزو کا چلاؤ ۔

O (خاموشی)

+ . دانشور حلقوں میں دہشت پھیلانے والا بزو کا چلاؤ۔

O (خاموشی)

+ یا ایک بھوت ڈاتی جسٹ شروع کردو ماسیز کے لیے

O اور ایک ئوت ڈاتی جسٹ، متولیوں کے لیے۔ ایک اُوت ڈاتی جسٹ، لاولدوں کے لیے۔ ایک کُوت ڈاتی جسٹ، مسخروں کے لیے، ایک دُوت ڈاتی جسٹ، فرشتوں کے لیے۔ ایک اور ڈاتی جسٹ، خواتین کے لیے۔

+ کوئی اچھا سا بزو کا چلاؤ۔ ایک ایک شل پچاس پچاس سو سو روپے میں بیچو۔

O مگر سوچنے کو تو 'پے اِنگ' ہونا چاہیئے۔

+ تو جہنم میں جاؤ ـــــ سُوَرا

O ζ ϖ δ Ψ # ! ✸ ✔

سنّاٹا

+ (جماہی) فلفل دراز 'سوچتی' ہے اور ڈاتی جسٹ بھی نکالتی ہے۔ ابھی برما گئی تھی شاکیہ مُنی کی مورتی خرید کر لائی ہے۔

O (چانٹنگ) بدّھاں شرَناں گچھامی ی ی ی۔

+ سامنے والے ذاکروں کے انڈر نرِشڈ ملڈے کے برابر قد ہوگا اس مورتی کا۔

O (چانٹنگ) دھمّاں شرَناں گچھامی ی ی ی۔

+ ہاتھی دانت کی ہے ـــــ اسے کہتے ہیں ہائی تھنکنگ۔

O (چانٹنگ) سنگھاں شرَناں گچھامی ی ی ی۔

+ فلفل ذہن پرست ہے۔ کلچر کی ڈاتی لیکٹکس کو سمجھتی ہے۔

O نا، نا۔ ریجنل کلچر کی جھوٹی ابجد ہوز کو۔

MASSES SHELL CHANTING DIALECTICS REGIONAL UNDER NOURISHED

+ ریخنل ہی سہی۔ آخر کو اکھڑی ہوتی بہاری ہے۔ شاکیہ مُنی کا صوبہ بھی وہی تھا۔

○ نکل آئے تھے۔

+ مگر لَوٹ کر گئے تھے۔

○ لَوٹ کر نہیں جاتے۔ نہ کنعان کو، نہ کپل وستو کو، نہ نیزا ارتھ کو، نہ مکّے کو۔ سمتوں اور مابعد سمتوں میں پھیل جاتے ہیں۔

+ تم کیوں لَوٹ لَوٹ کر جاتے ہو؟

○ کتّا ہوں

+ ابکے گئے تو کیا لاؤ گے؟

○ تانتیا ٹوپے کی ٹوپی۔

+ ذلیل! وہ رو کے فیلر کی مورتی بھی لا سکتی تھی۔

○ وہ کون؟

+ وہی فلفل دراز۔

○ وہ پی، آئی، ایس، ایس کی چمپا کلی یا نتھ لائی ہے۔

+ یہ کیا ہوتا ہے؟

○ اسٹے ٹس سمبل، سیوڈو انٹے لیکچو ئل والا۔

+ وہ ذہن پرست ہے، کلچر کی ڈائی لیکٹکس کو سمجھتی ہے اسی لیے ذاکروں کے ملڈے کے قد کے برابر......

○ (چانٹنگ) میں بُدھ کی پناہ میں آتا ہوں ں ں ں۔

+ (چڑ چڑاہٹ) کہنا کیا چاہتے ہو؟

○ (چانٹنگ) میں دھرم کی پناہ میں آتا ہوں ں ں ں۔

+ سُنو تو ____

ROCKEFELLER P.I.S.S. PSEUDO-INTELLECTUAL STATUS SYMBOL

○ (چانٹنگ) میں سنگھ کی پناہ میں آتا ہوں ں ں ں۔

سنّاٹا

+ (استفہام) شاکیہ منی؟

○ مدّتوں بھوکے رہے، نظامِ ہضم برباد ہو گیا۔ بعد میں پیچش ہو گئی تھی۔ اسی میں فوت ہوئے۔

+ مگر فلفل دراز کا بدھ ....

○ عوامی رومان کے سستے سینٹ میں بھبکتا ہوا، سابق پرنس آف ویلز، دس مہینے کا ایڈورڈ ہشتم، حال ڈیوک آف ونڈسر۔

SCENT

+ فلفل کا ......

○ ایڈورڈ ہشتم!۔ وہ کہتا ہے ......

+ ہائی تھنکنگ؟

○ کہتا ہے: اِن دا نیم آف ہائی تھنکنگ (اینڈ کارنل لَو) آئی، پرنس سِدھارتا گوتما، دا وُڈ بی لارڈ شاکیہ منی بُدّھا (آف فلفل فیم) ڈو ہیئر بائی ایبڈی کیٹ اور ایکٹرامیت کی طرح جھٹکے سے گھوم کر ....

+ گوتما ....

○ ایکٹرامیت کی طرح جھٹکے سے گھوم کر لکڑی کے پروپ ـــــ دی تھرون پر لات مارتا ہے، ٹھاک!

PROP THE THRONE

اردو میں اُسے قُرّۃ العین بی بی نے پوسٹر کلر کے ڈابز دے دیکر، سخت، رومانی ٹیکسچر میں لتھیڑ دیا ہے۔

DAUBS TEXTURE

+ کسے؟ دی تھرون کو یا ایکٹرامیت کو؟ فلفل کو یا بُدّھا کو؟

○ دونوں کو!

"IN THE NAME OF HIGH THINKING (& CARNAL LOVE) I, PRINCE SIDDHARATA GAUTAMA, THE WOULD-BE LORD SAKKIYAMUNI BUDDHA (OF PHIL-PHIL FAME) DO HEREBY ABDICATE"

+ کون دونوں؟ ..... فِلفِل اور امیت؟ یا فِلفِل اور بُڈّھا؟ یا بُڈّھا اور امیت؟
یا امیت اور دی ٹھروِن؟ یا دی ٹھروِن اور فِلفِل؟ یا بُڈّھا اور دی ٹھروِن؟

○ دونوں!

+ (جھنجھلاہٹ) کون دونوں؟

○ ڈِٹ ٹُو! DITTO

+ لات ......

○ ہاں لات مارتا ہے ــــ ٹھاک!

+ فِلفِل.

○ ٹھاک ٹُو فِلفِل ٹُو ــــــــ ٹھاک! لات مارتا ہے اور لانگ شاٹ
میں محل کے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ شوٹنگ ڈے فار نائٹ اینڈ
پی، آئی، ایس، ایس فار فِلفِل ۔

+ گویا فِلفِل ......

○ ایکسٹرا امیت کی مورتی لائی ہے۔

+ (عقیدت، مگر ذاکروں کے انڈر نرشڈ مِلڈے کے قد کے برابر!

○ تنگ پیشانی کے علاقائی کلچر میں لتھڑی ہوئی، سستے سینٹ میں بھبکتی ہوئی۔

+ انٹی ریَر ڈیکوریشن INTERIOR DECORATION

○ نا۔ نا۔ ایکسٹی ریَر ڈیکوریشن۔ پی، آئی، ایس کے چلتے ہوئے ٹیسٹ میں۔ EXTERIOR TASTE

+ کتنے پن کی بات ہے۔ برسوں پہلے ہرمن ہیسے نے بھی سدھارتا لکھی تھی۔

○ اچھا کیا تھا۔ میں بُرا نہیں مانتا۔

+ آواز میں جھلسن کس لیے؟

○ سدھارتا لکھی تو 'نروان' اور 'بُڈّھا' زبردست 'اِن' چیز ہو گئے اور لوٹر لوٹر

THAAK TO PHIL-PHIL TOO
SHOOTING DAY FOR NIGHT & P.I.S.S. FOR PHIL-PHIL
UNDER NOURISHED
HERMANN HESSE

مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس اور مڈل کلاس کے فونی ذہن پرستوں نے گوتم کو....

+ گوتم نے....

○ گوتم نے شکر قند جیسی کوئی رُوٹ پکوا کر کھائی تھی، بعضے کہتے ہیں سُوّر کا گوشت تھا۔

+ فلفِل کا....

○ نہیں سُوّر کا ــــ اور انھیں سخت پیچش ہو گئی تھی۔ اسی میں فوت ہوئے۔

+ خونی پیچش میں.....

○ زبردست رومان ہوتا ہے۔ جیسے جیسے سُرخ رنگوں والا اور زرد اور کتھئی اور سنہری اور اوپیک۔ OPAQUE

+ (ہنسی) فلفِل کا فِل بھی پیچش کا پرانا مریض ہے۔ مگر شراب نہیں چھوڑتا۔ کہتا ہے روزجی زز کے ساتھ مصلوب ہونا پڑتا ہے۔

○ (خاموشی)

+ (گوسپ) فلفِل نے ایک روز تین آل پنوں کو اسٹے ریلائز کیا۔ دو، فِل کی دونوں کلائیوں میں اتار دیں ایک اُس کے پیروں کے پنجے ملا کر چبھو دی پھر پوچھا کہ تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟ کہتے لگا پنیں نکال لو، ابلاغ میں گڑبڑ ہو گئی ہے، میں تو ایتھنز والا ہوں۔ مجھے تو ہیملاک (گویا بی ہائو برانڈی) کا کٹورا چاہیئے۔ (کمینہ ہنسی)

○ خیال کی تکلیف کئی کئی دن کے فاقے پر سپرامپوز ہو جاتی ہے اور بدن کی اذیت سے ہزار درجہ شدید ہے۔ برین سیلز عذاب میں لرزتے ہیں اور کوئی جواب نہیں آتا۔

ــــ نروان جواب لاتا ہے، ایک طرح کی ریلیز ہے۔

+ ریلیز یا ڈسچارج؟

○ ریلیز، اور پناہ ــــ کہ بدّھاں شرناں گچھامی ــــ کہ میں آدی بُدھ کی پناہ میں

ROOT JESUS GOSSIP STERILIZE HEMLOCK
'BEEHIVE' BRANDY SUPERIMPOSE BRAIN CELLS RELEASE

آتا ہوں، کہ ایک رہائی ایک اسیری میں آتا ہوں۔

+ اوہ!

O اوہ نہیں ہوَہ —— ایک سبلائم ریلیز کی ہوَہ۔

+ ہوَہ!

O جیسے وجود کی فصد کھلواتی اور شریان کا منھ کھلا چھوڑ دیا۔

+ اور اِسٹے ریلائزڈ آل پنیں؟

O (چیخ)، اَن اِسٹے ریلائزڈ! اور کند نوکوں والی میخوں کے بھدّے سَروں سے قطرہ قطرہ زندہ لہو ٹپکتا ہے۔

+ اُف!

O اور ایک پہر اور دوسرے پہر اور تیسرے پہر تک ٹپکتا رہتا ہے۔

+ اُف!

O خیال کا کرب پھر بھی قیامت اذیت ناک ہے۔

+ شیور!

O بدن کی تکلیف میں بھی تین پہر بعد پکارا جاتا ہے کہ اوہی، تو نے مجھے ترک کر دیا۔

+ ہاؤ ٹیرے بِل!

O اور ایتھنز: غذا کی نالی کو لیر لیر کر دیتا ہے اور معدے کی تھیلی ایسے پھٹ جاتی ہے جیسے ربڑ کے غبّارے میں گندھک کا کمزور تیزاب ڈال دیا ہو۔

+ مہاتما.....

O فاقے کی دھوپ میں بدن کمہلا جاتا ہے۔ خونی پیچش میں جیتا جیتا لہو تلاری سے بہتا ہے۔

+ قلقل کا......

SUBLIME RELEASE STERILIZED UN-STERILIZED

SURE! HOW TERRIBLE!

○ فاقے میں، اور زرد اور سُرخ اور کتھئی اور سنہری اور اوپیک پیچش میں رومان ہے۔

+ فلفِل کا.....

○ فلفِل کا ایکٹرا میت مکڑی کے پروپ پر ٹھاک کر کے لات مارتا ہے اور جھٹکے سے مڑ کر لانگ شاٹ میں محل سے باہر نکل جاتا ہے (شوٹنگ ڈے فارنائٹ اینڈ پی، آئی، ایس، ایس فار فلفِل)

+ فلفِل.....

○ ہاتھی دانت کا ایکٹرا میت ذاکروں کے اَنڈر ٹرِ شنڈ لمڈے کے قد سے چلتا ہوا راج دھانی چھوڑ دیتا ہے اور اولاد نرینہ راہُل (دیو بَرمَن) کو چھوڑ دیتا ہے اور مکڑی کے پروپ کو چھوڑ دیتا ہے۔

+ اور نِروان ؟

○ ٹھاک ٹھاک ٹھاک یہ تین لاتیں وجود کی بے اساسی پر اور ٹھاک سے یہ چوتھی لات میری اپنی پتلون کی سیٹ پر ــــــ کہ ــــــ سوچنا بے اِنگ ہوتا ہے ! SEAT

+ سوچنے کو کوئی منع نہیں کرتا۔

○ یہ بے اِنگ ہوتا ہے۔

+ تو ایک اچھا سا بزو کا چلاؤ۔ دانش وَر حلقوں میں دہشت پھیلانے والا بزوکا چلاؤ ــــــ ڈزِن ن ن ن گ کرو !

○ د بے دلی، ڈز نگ۔

+ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی !

○ ہم، تم اور دوسرے حشرات الارض اس سے بڑی ڈز نگ پر قادر نہیں ہیں۔

ترلوچن

جو کچھ ہُوا اس سے پہلے یہاں انسانی بستیاں موجود تھیں اور جانور، درخت، دریا اور پہاڑ سبھی تھے۔ ایک تواتر کے ساتھ موسم آتے رہتے تھے۔ چیزیں اُگتی تھیں، بڑھتی، پھیلتی اور پُرانی ہوتی تھیں اور رسان سے مر جایا کرتی تھیں کبھی کبھی کوئی قہقہہ مار کر ہنس بھی دیا کرتا تھا۔ مجموعی طور پر سب ٹھیک ہی تھا۔

عین الحق یہ سب کچھ ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی کُتے کا مُوت اس کی پیٹی کھول کر چیزوں کی فہرست نہ چُرا لے جاتا جو اس نے اتنی دل سوزی سے تیار کی تھی تو عین الحق ہرگز ہرگز وہ نہ کرتا جو اُس نے کیا۔

اُس نے جو کچھ کیا وہ وقتی اشتعال اور مایوسی کے تحت کیا تھا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ اب تو کچھ تھا ہی نہیں جسے پھر سے ترتیب دیا جاتا۔ سب ختم ہو چکا تھا۔

اور جو کچھ ہوا وہ پلک جھپکتے ہو گیا۔ پیٹی خالی دیکھ کر اُس نے اہلوک، پرلوک اور دیولوک تینوں کی ڈوریاں اپنی انگشتِ شہادت پر لپیٹ کر مٹھی بند کی، ایک ذرا کندھا جُھکا کر جھٹکے سے انہیں اپنی پُشت پر لیا، سیدھے ہاتھ

کی مٹھی پر مٹھی کس کر اللہ اللہ کہا اور ہوا میں جیسے کدال چلاتے ہوئے تینوں لوک زمین پر دے مارے۔

یہاں تک بھی ٹھیک تھا، بات کچھ زیادہ بگڑی نہیں تھی۔ لیکن اس کے بعد تو عین الحق نے غضب ہی کر دیا۔ وہ پورے قامت سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جھٹکے سے اسٹکنگ پلاسٹر کا وہ ٹکڑا اپنی پیشانی سے نوچ پھینکا جسے وہ پابندی سے نماز کے گٹّے والی جگہ پر چپکا لیا کرتا تھا۔ پھر اس نے سر جھکایا، زمین کی طرف دیکھا اور تمام و کمال قہاری میں اپنی تیسری آنکھ کھول دی اور تینوں لوک جلا کر خاک کر دیے۔

سو اب دھوئیں اور راکھ کے سوا کچھ نہیں تھا جسے پھر سے ترتیب دیا جاتا۔ سب ختم ہو چکا تھا اور عین الحق جانتا تھا کہ دھوئیں اور راکھ کو ترتیب نہیں دیا جا سکتا۔ یہ خاتمہ ہے۔

یہ سب ایک بلّی سے شروع ہوا تھا۔ ایک دن گلی سے گزرتے ہوئے اس نے اچانک اس بلّی کو دیکھا اور اسے فہرست بنانے کا خیال آ گیا۔ وہ بلّی اس قدر زخمی اتنی میلی اور جگہ جگہ سے اتنی نچی کھچی تھی کہ ساری باتیں کاغذ پر لکھے بغیر یاد نہیں رکھی جا سکتی تھیں۔ اس نے سوچا، فہرست بنانا اچھا رہے گا۔ وہ اب تک چیزوں کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا آ رہا تھا۔ لیکن چیزیں اتنی بہت سی ہو گئی تھیں اور برابر بڑھتی جا رہی تھیں اور ان کی تفصیل اتنی طولانی ہوتی جا رہی تھی کہ اب ذہن میں محفوظ رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں بھولنا شروع نہ کر دے اس لیے اس نے ایک بڑے کاغذ پر سات سو چھیاسی لکھا اور نمبر شمار اور نام اشیا اور ان کے کوائف اور کارہائے مجوّزہ اور تاریخ عملدرآمد کے خانے بنائے اور ان خانوں میں اس نے سب چیزیں درج کرنا شروع کر دیں۔ تاریخ

عملدرآمد کا خانہ ابھی خالی رکھا اس لیے کہ پہلے وہ چیزوں کو اور اُن کی تفصیل کو حافظے سے کاغذ پر منتقل کر لینا چاہتا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ باقی عملدرآمد میں دیر ہی کتنی لگتی۔ فہرست مکمل ہونے کے بعد وہ کسی بھی دن اور کسی بھی وقت کارہائے مُجوّزہ کے خانے میں لکھی ہوئی باتوں پر عملدرآمد کر کے معاملے نمٹا سکتا تھا۔

تو اُس نے سب سے پہلے نمبر شمار ایک پر بتّی کو درج کیا اور اُس کے کوائف لکھے اور کارہائے مُجوّزہ میں درج کیا کہ اُسے نئی کھال وغیرہ دینی ہے اور تاریخِ عملدرآمد کا خانہ خالی چھوڑ دیا۔ دوسرے نمبر پر عین الحق نے ہیڈ کانسٹیبل لطافت میر خاں کی بیوہ رقیہ بیگم کا مسئلہ درج کیا، وہ اسی بلاک کے ایک لاولد مکان میں تنہا رہتی تھی، اسے عرق النسا کی شکایت تھی اور دُکھ اور تنہائی میں اُس کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ یہاں کارہائے مُجوّزہ کے خانے میں اُس نے طے کیا کہ رقیہ بیگم کو عرق النسا سے چھٹکارا دینا ہے اور ایک بے پالک کے بیٹے بیٹیوں سے اُس گھر کا صحن آباد کرنا ہے۔ رقیہ بیگم کے بعد اُس نے بھورے خاں کولڈ ڈرنک اینڈ سگریٹ کارنر کو درج کیا جو بہتّر برس کا منہ کا ماندہ امرد پرست تھا، اس کا گھر بار نہیں تھا، دکان کے تھڑے پر ہی سو رہتا تھا۔ اُسے خوبصورت لڑکوں کو دکان پر بٹھانے اور اسلامی تاریخی ناول پڑھوا کر سننے کا شوق تھا۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ لڑکے بھاگ جاتے تھے اور وہ انہیں یاد کر کر کے روتا تھا اور فتح برموک کتنے ہی دن ملتوی رہتی تھی عین الحق نے بھورے خاں کولڈ ڈرنک اینڈ سگریٹ کارنر کو درج کیا اور اُس کے کوائف لکھے اور کارہائے مُجوّزہ میں لکھا کہ ایک خوبصورت اور باوفا لڑکا ہمہ وقت موجود رہے تا کہ بھورے خاں جدائی اور دکھ میں دوہرانہ ہو جائے اس لیے کہ بہتّر برس بہت ہوتے ہیں۔

پھر اُس نے ہزارے سے آئے ہوئے شیر زمان موچی اور اُس کے نیک نفس

بھابیوں کو درج کیا جو فجر سے پہلے اُٹھ کر شیر زمان کی چارپائی پہ اکڑوں بیٹھ جاتے تھے اور اُس سے اٹک اٹک کر قرآن پڑھا کرتے تھے۔ اُن سب کی بیویاں ملک میں تھیں اور وہ دن بھر شیر زمان کی ہدایت کے مطابق جوتے گانٹھتے اور ٹیپ ریکارڈر پر سلطان میاں قوال کی قوالیاں سنتے تھے۔ عین الحق نے اُن کے کوائف لکھے اور کارہائے مجوّزہ میں درج کیا کہ ان سب کا ان کی بیویوں سے ملاپ کرانا ہے اور لکھا کہ شیر زمان کی بواسیر خونی رفع کرنی ہے کیونکہ وہ بچوں اور قلیل آمدنی والے کمزور لوگوں سے بھی نرمی سے بات کرتا تھا۔ پھر عین الحق نے عقاب کے سے تجسس والی مائی نوراں مسی کو درج کیا جس کے پنجے بھی عقاب کے تھے اور عین الحق نے اُس کے کوائف لکھے اور کارہائے مجوّزہ میں لکھا کہ مائی نوراں مسی کو نئی ریڑھ کی ہڈی دینی ہے اور بلاک نمبر دو سے بلاک نمبر آٹھ تک مکانوں کی عقبی گلی میں وافر مقدار میں پلاسٹک کے ٹکڑے، ہڈیاں اور ردی کاغذ مہیا کرنا ہے جو عرصہ بارہ سال تک فراہم رہیں کس لیے کہ نوراں کا ناسور اسے اس سے زیادہ کی مہلت نہیں دے گا۔ عین الحق نے دفعِ ناسور از پنڈلی لکھ کر کاٹ دیا کیونکہ اس طرح بعض گھروں سے ملنے والا خصوصی بونس بند ہونے کا احتمال تھا اور یہ بات کسی عنوان بھی نوراں کے لیے مناسب نہ تھی۔ پھر بلاک نمبر دو سے بلاک نمبر آٹھ تک آتے ہوئے پارک سے متّصل مدکامنی کے پیڑ کے نیچے پہنچ کر عین الحق نے دیکھا کہ تنور والے مکھا دولا نے مدکامنی کے نوعمر تنے سے اپنا مینڈھا باندھ باندھ کر اُس کی نرم چھال کو اُدھیڑ دیا ہے تو عین الحق نے اُدھڑی ہوئی چھال کے نم دائرے سے اپنی اُنگلیوں کے پور مس کیے اور مدکامنی کے پیڑ سے وعدہ کیا اور پیڑ کے کوائف درج کیے پھر کارہائے مجوّزہ میں لکھا کہ مدکامنی کا زخم بھرنا ہے اور تالیفِ قلب

کے لیے نئی کونپلیں بھی دیتی ہیں۔ پھر اُس نے بولی ٹکنگ والے سہیل کو درج کیا جسے بیرونِ ملک بھیجنا تھا اور عبدالقدیر قادری اور عترت حسین زیدی کو درج کیا جنہیں ترقیاں دینی تھیں اور عین الحق کی مصروفیات بڑھتی چلی گئیں۔

اُس نے برتن قناتوں والے رنگے کو درج کیا جو گھر والی کی فحش بدعنوانیوں کے سبب ڈھے گیا تھا اور پور پور سے ہلاک ہو رہا تھا تو عین الحق نے یہ لکھا کہ اس بی بی کے نظام میں مناسب تبدیلیاں کرکے اُسے رنگے کی اطاعت میں بحال کرنا ہے اور عین الحق نے موٹر سائیکل والے لڑکے کو درج کیا جو صبح و شام چکر لگاتا تھا اور بلاک نمبر تین میں وہ بچی اُسے خاطر میں نہ لاتی تھی تو عین الحق نے اسے اُداسی سے موٹر سائیکل پر چکر لگاتے دیکھا اور نرم سرگوشیوں میں وعدہ کیا کہ سب انتظام کر دیا جائے گا اور اُس نے ممّو گاڈر کی بیمار مرغی کو درج کیا اور اس طرح چیزوں کی فہرست طولانی ہوتی چلی گئی۔

وہ چراغ جلے بیٹھتا تو کہیں رات ڈھلے دن بھر کے اندراجات مکمل کر پاتا اور اب یہ ہونے لگا کہ دو نمبر یا تین نمبر بلاک سے آٹھ نمبر تک آتے آتے کبھی ایک آدھ چیز بھول جاتا اور اُسے دوبارہ موقع پر پہنچ کے اندراج مکمل کرنے پڑتے اور اسی جھنجٹ میں چار نمبر بلاک کی حمیرا کا ٹوکیما درج ہونے سے رہ گیا۔

اور جب اس اندراج کی ضرورت نہ رہی تو بلاک نمبر چار کے اختتام پر عین الحق ظاہر ہُوا۔

وہ سڑک کی طرف سے گلی میں مڑا اور اُس نے دیکھا کہ مسجدِ نور کا چھوٹا والا گہوارہ پھولوں میں رکھا ہوا ہے۔ عین الحق پیلا پڑ گیا۔ اُس نے لرزتے کانپتے ہُوئے دوپہر کے سناٹے سے پوچھا کہ کیا حمیرا؟ وہ گہوارے کے ساتھ ساتھ

رینگتا ہوا چھ نمبر بلاک تک گیا اور اُس نے دو پہر کے سناٹے سے پوچھا کہ کیا حمیرا؟ اور وہ چھ نمبر سے آٹھ نمبر بلاک کے سرے تک دوڑتا ہوا گیا اور خجالت کے آنسوؤں میں بھیگتے ہوئے اُس نے گہوارے کا پایہ تھام لیا اور ساتھ ساتھ چلنے لگا اور ہولے ہولے اپنی صفائی میں کہتا چلا کہ بی بی میں بھول گیا تھا! بِٹیا میں بھول گیا تھا! اماں میں بھول گیا تھا! اور آٹھ نمبر بلاک کی حد پر اُس نے گہوارے کا پایہ چھوڑ دیا۔ پھر عین الحق نے ایک چیخ کی بازگشت میں بلاک نمبر دو کی طرف سَعی کی اور پکارتا چلا کہ میں بھول گیا تھا! پھر باقی دن اور باقی رات وہ اسی چیخ کی بازگشت میں رہا۔ وہ بلاک دو سے بلاک آٹھ تک اور بلاک آٹھ سے بلاک دو تک گونج کی طرح سنسناتا رہا اور جو کچھ درج ہونے سے رہ گیا تھا دیوانہ وار اپنی یادداشت میں محفوظ کرتا گیا۔ ایک ایک مکان پر سے گزرتے ہوئے اُس نے اپنے حافظے میں سب چیزوں اور سب لوگوں کی حاجت مندیاں اور تمام چھوٹے بڑے دکھ محفوظ کیے اور طے کیا کہ مُرغ کی بانگ سے پہلے انہیں فہرست میں درج کرے گا اور جب مرغ بانگ دے رہے ہوں گے تو عملدرآمد کرے گا۔

ایک پہر رات باقی تھی کہ وہ اپنے کمرے پر آیا اور یہ دیکھا کہ کمرے کا تالا ٹوٹا ہُوا ہے اور اُس کی پیٹی اوندھی پڑی ہے۔ کوئی کُتے کا موت اُس کی فہرست چرا لے گیا تھا۔

پیٹی خالی دیکھ کر عین الحق نے حیراتی میں چھ طرفوں پر نظر ڈالی اور مایوسی میں سر ہلایا اور گمان سے بالاتر ہُوا اور تب ہی عین الحق نے اہلوک، مہلوک اور دیو لوک تینوں کی ڈوریاں اپنی انگشتِ شہادت پر لپیٹ کر مٹھی بند کی ایک ذرا کندھا جھُکا کر جھٹکے سے انہیں اپنی پشت پر لیا اور مٹھیاں کس کر ہوا میں کدال چلاتے ہوئے تینوں لوک زمین پر دے مارے —— پھر وہ

پورے قامت سے تن کر کھڑا ہوگیا اور جھٹکے سے اپنی پیشانی کا پلاسٹر نوچ پھینکا۔
پھر عین الحق نے سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھا اور تمام و کمال قہاری ہیں اپنی
تیسری آنکھ کھول دی اور تینوں لوک جلا کر خاک کر دیے۔

مُردہ گھر میں مکاشفہ

وہ مَیلی سی ٹوپی اوڑھے تھا۔ بار بار کے دُھلے ہوئے ملگجے کپڑوں سے اُس کی مالی ابتری کا اندازہ ہوتا تھا۔ آنکھوں سے لگتا تھا کہ روز سرمہ لگاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ نیک دکھائی دیتا تھا۔

میں نے اُسے این۔ او۔ سی دکھایا تو تپاک میں وہ دُہرا ہوگیا، کہنے لگا: "اس کی کیا ضرورت تھی جناب! ویسے اگر ساتھ میں آپ دو فوٹو سٹیٹ کاپیاں بھی لے آتے تو بڑی مہربانی ہوتی۔"

میں نے اپنا ٹفن بکس اور تھرموس اُٹھایا اور جانے کو ہوا تو وہ بڑی نیکی سے ہنسا اور کہنے لگا: "ابھی رہنے دو جناب! دوبارہ کہاں جاؤ گے۔ پھر کبھی آؤ تو دے دینا۔ آپ اپنے ہی آدمی ہو۔" مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں اُس کا آدمی نہیں تھا تو پھر وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا۔

بہت مشکلوں کے بعد مجھے این۔ او۔ سی ملا تھا۔ میں نے بائیس صفحوں کا سوال نامہ بھرا تھا۔ ایک سو چالیس تصدیق ناموں، حلف ناموں، رُکنیت ناموں۔ استحقاق ناموں اور عزا داری کی پرچیوں کی نقلیں فراہم کی تھیں، ساتھ میں طبّی جدولیں اور دندان سازی کے چارٹ مہیّا کیے تھے۔ تب کہیں جا کے مہینوں میں مجھے یہ این۔ او۔ سی ملا تھا۔ میں کسی کا آدمی ہوتا تو کاہے کو مجھے یہ کھکیڑ اُٹھانی پڑتی۔ مگر میں خاموش رہا۔ مجھے صبح سے شام تک اِس آدمی کی معیّت میں وقت گزارنا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ صبح ہی صبح اُسے ناراض یا بیزار کر دوں۔

میں نے ٹفن بکس اور تھرموس دوبارہ فرش پر رکھے تو وہ بولا: "جناب!

آپ انھیں اُوپر رکھ دو آرام سے۔ کوئی حرج نہیں ہے۔" اُس نے میرے ٹوکنے سے پہلے میرا تھرموس اور ٹفن بکس اُٹھایا اور دونوں قریبی سلیب پر پڑی لاش کے سینے پر رکھ دیے۔

" ایلو جناب! اب آپ بھی آرام سے بیٹھ جاؤ۔" یہ کہتا ہوا وہ کونے کی طرف بڑھا اور وہاں سے ایک پہیّہ ٹوٹی وھیل بیرو کھینچ لایا۔" میں تو جی ڈیوٹی پر ہوں، شام تک کھڑا رہوں گا، آپ اِس میں بیٹھو آرام سے۔" وہ ہنسا۔" بے کار پڑی ہے۔ بَرف تو اب آتی نہیں۔"

" کیوں، برف کیوں نہیں آتی؟"

" آپ تو جانتے ہیں نا جی، بَرف اب کدھر آتی ہے۔"

میں نہیں جانتا تھا لیکن میں چُپ رہا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا وھیل بیرو کے پاس پہنچ گیا۔

" میں نے تو جی کتنی بار لکھوا کے پہنچوایا کہ اِدھر ایک بینچ ڈلوادو، بڑے بڑے عزّت والے لوگ آتے ہیں، مگر جی کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔"

اُس نے یقیناً لکھوا کر پہنچوایا ہوگا مگر کیوں کہ میں حتمی طور پر یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا اِس لیے چُپ رہا۔

وہ اب تک میرے این۔ او۔ سی کی چار تہیں بنا چکا تھا، اب اُس نے اِسے اپنی بَنڈی کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ پھر بڑے تجسّس سے پوچھنے لگا:" آپ تصویر بھی بناؤ گے جی یا صرف 'مشاحدہ' کرو گے؟" وہ صِرف کو صَرف اور مشاہدے کو ھائے حُطّی سے ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اِس میں حرج کچھ نہیں تھا اِس لیے میں نے جواب دیا کہ میں تصویر نہیں بناؤں گا۔

میرا جواب سن کر وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بڑی چالاکی سے اپنی بَنڈی

کی جیب تھپکنے لگا۔ اسی جیب میں کچھ دیر پہلے اُس نے میرا این۔ او۔ سی رکھا تھا۔ کہنے لگا: "ہاں جی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو آپ، سفید این۔ او۔ سی صرف مشاہدے کا ہوتا ہے۔ اس پہ تصویر بنانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ تصویر والا این۔ او۔ سی نیلا ہوتا ہے۔ نیلا آج کل دے نہیں رہے کسی کو، حالات صحیح نہیں ہیں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا، وہ کہنے لگا: "تو ٹھیک ہے جی آپ بیٹھیں، میں ذرا نلکا کھول دوں گرمی ہوگئی ہے۔"

اُس نے کونے میں لگا ہوا نل کھول دیا تو یکساں آواز کے ساتھ پانی بہنے لگا۔ میں نے دیکھا ٹائل والے کونے سے ایک نالی شروع ہوتی تھی جو کوئی بالشت بھر چوڑی تھی اور فرش پہ خاصی گہری بنائی گئی تھی۔ یہ نالی لاشیں رکھنے والے چاروں سلیبوں کا چکر لگاتی ہوئی مُردہ گھر کی مغربی دیوار کو چھیدتی کہیں باہر نکل جاتی تھی۔ نالی جہاں سے دیوار کے پار جاتی تھی وہاں ایک مضبوط جالی لگی تھی۔ شاید چوہوں، تل چٹوں اور ناپسندیدہ چیزوں کو آنے سے روکنے کے لیے یہ انتظام کیا گیا تھا۔

اُس نے نل کھولا تو مہارت کے ساتھ بناتے ہوئے نالی کے ڈھال پر پانی تیزی سے بہنا شروع ہوگیا۔ کچھ ہی دیر میں آس پاس ہلکی سی خنکی کا احساس ہونے لگا۔ "آپ نے دیکھا جناب! عُصُولاً تو یہاں برف کی ضرورت ہی نہیں پڑنی چاہیے۔" اُس نے اصولاً کو عُصُولاً کی طرح ادا کیا تھا جو ظاہر ہے بے معنی لفظ تھا۔ کہنے لگا: "برف نہیں بھیجتے تو نہیں نا بھیجیں یہاں پانی کی ٹھنڈک ہی کافی ہوتی ہے جناب! ویسے میرے پاس یہ بھی ہے۔" اُس نے مجھے سیاہ صابن دانی جیسا ایک ٹرانزسسٹر ریڈیو دکھایا۔ یہ ٹرانزسسٹر ریڈیو اس نے کالی ریشمی ڈوری کی مدد سے اپنی کلائی میں پہن رکھا تھا۔ کہنے لگا: "اگر کبھی خدانخواستہ تعفن پھیلنے کا

خطرہ ہوتا ہے جناب، تو میں اِسے چلا دیتا ہوں۔"

اس نے ٹرانزسسٹر چلا دیا۔ کوئی فضول سی عورت ایک فضول سا ملّی نغمہ گا رہی تھی جس میں وطن کی بلائیں لینے اور اس کے چہرے پر نظر کا ٹیکہ لگانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔ میں نے نغمہ سنتے ہوئے یہ بات نوٹ کی کہ طبلہ بجانے والا دوسرے تمام سازندوں اور اس فضول سی عورت پر حاوی آگیا تھا۔ ٹھیکے ہی سے پتہ چل رہا تھا کہ اپنی اس 'کامرانی' پہ بہت خوش ہے اور اب کسی کو پنپنے نہیں دے گا۔ میں مسکراتے مسکراتے رُک گیا۔ یہ مسکرانے اور اس طرح کی باتیں نوٹ کرنے کی جگہ نہیں تھی۔

وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پہلے مسکرایا پھر خوش دلی سے ہنسا، کہنے لگا۔ "یہاں سب چلتا ہے جناب! آپ آرام سے مسکراؤ۔ خیر ہے۔ یہاں کوئی نہیں دیکھتا۔ ویسے جناب بات کیا تھی؟"

وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں اُسے اصل بات میں کیسے بتا دیتا۔ خاموش رہنا بھی مناسب نہیں تھا اِس لیے میں نے ٹالنے کو کہہ دیا کہ میں برف کے بارے میں سوچ کر مسکرا رہا ہوں۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا، کہنے لگا "ہنسنے کی بات نہیں ہے جناب رونے کا مقام ہے۔ مجھ سے پہلے جو اِس جگہ ڈیوٹی دیتا تھا اُس کا رشتے کا بھائی شہر میں سوڈے لیمن کی ریڑھی لگایا کرتا تھا۔ وہ روز آتا تھا اور ساری بَرف اُٹھائے جاتا تھا اور یہاں لاشیں پڑی سڑتی رہتی تھیں۔ توبہ توبہ ربا میریا۔ دیکھیں ناں جی آدمی کو اِس قدر بے حس بھی نہیں ہونا چاہیے جی، مرنا سب نے ہے۔"

مجھے اُس بے حس، خبیث، لالچی آدمی کی حرکت کا سُن کر بہت تکلیف پہنچی تھی۔ مگر اب کیا کیا جاسکتا تھا، بات پُرانی ہو چکی تھی اِس لیے میں سر جھکا کر وھیل بیرو میں بیٹھ گیا۔

وہ کہنے لگا: "لالچ میں آدمی کس حد تک گر سکتا ہے جناب! آپ 'عندازہ'
نہیں لگا سکتے"، یہ کہہ کر اُس نے نیک آدمیوں کی طرح ٹھنڈی سانس لی: "ہا ہہ!"
بےحس آدمی کی خباثت کو یاد کر کے وہ بہت اداس ہوگیا تھا۔ میں نے تسلّی کے الفاظ
کہنے کے لیے اُس کی طرف رُخ کیا اور دیکھا کہ وہ تو خود سر گھمائے بغیر صرف پتلیاں
پھرا کر چالاکی سے میرا ردّ عمل دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس وقت پہلی بار مجھے
شک ہوا، میں سوچنے لگا ممکن ہے وہ اِتنا نیک نہ ہو جتنا نظر آتا ہے: تاہم بدگمانی
اچھی چیز نہیں ہوتی، میں نے اِس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور کچھ اور سوچنے لگا۔
مگر وقت اور جگہ دونوں ایسے تھے کہ زیادہ دیر تک کچھ بھی سوچنا ممکن نہیں
تھا۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ یہاں برابر کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے جو سوچنے کے عمل
کو روک روک دیتا ہے۔ اس وقت بھی دو باتیں ایک ساتھ ہونے لگیں۔ کونے والے
نل سے شروع ہو کر جو ڈھلواں نالی سلیپوں کے چکر لگاتی مُردہ گھر سے باہر چلی
جاتی تھی۔ میں نے اس کے بہتے ہوئے پانی میں ایک تل چٹا دیکھا اور جب وِھیل بیرو
میں بیٹھے بیٹھے گردن اُچکا کر میں نے اس منظر کی تصدیق کرنا چاہی تو اُس نے اپنے
ہاتھ میں پہنے ہوئے ٹرانزسسٹر ریڈیو کی آواز ایک دم بڑھا دی۔ حیرت ہے، میں
نے سوچا، آخر اِسے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر ایسی کچھ زیادہ حیران ہونے
والی بات بھی نہیں تھی۔ مجھے اِن سب باتوں کے لیے تیار ہو کر آنا چاہیے تھا۔
دوسری سب تیاریاں تو میں کر کے آیا تھا۔ ٹفن بکس اور تھرموس تک لے
آیا تھا۔ دونوں چیزیں سامنے سلیب پہ رکھی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ
میں دوپہر کے لیے آلو کی قتلیاں تلوا کر لایا ہوں۔
میں تشویش کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے ٹفن بکس ہٹا دینا چاہیے۔ قتلیاں،
ٹفن بکس میں رکھتے وقت بہت گرم تھیں۔ نچلے خانے میں ہونے کی وجہ سے قتلیوں

کی تمام گرمی اس وقت لاش کے سینے میں منتقل ہو رہی ہو گی۔

مجھے وھیل بیرو سے اُٹھتے دیکھ کر اُس نے ریڈیو بند کر دیا اور خصومت سے دیکھتا ہوا میری طرف بڑھا۔

"کیا بات ہے جناب؟ آپ آرام سے نہیں بیٹھ سکتے؟"

"یہ یہاں سے ہٹانا ہے۔"

"یہاں سے ہٹاؤ گے تو پھر کہاں رکھو گے؟"

"یہ الماری جو ہے سامنے۔"

"ہاں ہے.... تو؟ الماری کا کیا کرنا ہے؟"

"اِسے کھولو میں ٹفن بکس اور تھرموس اندر رکھوں گا۔"

"الماری نہیں کھلتی جناب!"

"کیوں؟"

"دیکھو جناب! میں نے آپ سے این. او. سی کے دو فوٹو سٹیٹ مانگے تھے جو آپ پیش نہ کر سکے۔ یہ تو میری مہربانی تھی جو پھر بھی آپ کو....."

"تمھی نے روکا تھا۔ میں تو جا رہا تھا کاپیاں بنوانے..... ٹھیک ہے۔ اب لے آتا ہوں۔"

وہ بہت فتح مندی سے بولا: "اب تو ٹائم گزر گیا جناب! شام سے پہلے آپ باہر نہیں جا سکتے، نہ کوئی اب یہاں آسکتا ہے۔ آرڈر یہی ہے۔"

"کمال ہے! کس قسم کے آدمی ہو تم؟"

"دیکھ لو..... اپنا تو یہی ہے۔" کہہ کر وہ دوبارہ ریڈیو چلانے کو ہوا مگر کچھ سوچ کر کلائی کی گھڑی دیکھنے لگا۔ گھڑی دیکھتے ہوئے اس نے بڑی نیکی سے اپنے سر پہ ٹوپی ٹھیک کی اور "ایلو جناب!" کہہ کر وہ دوسرے سلیب پر چڑھ

گیا جو مجھ سے دُور اور دیوار کے بالکل قریب تھا۔ میں سمجھا اب یہ اپنا دن کا کام شروع کرنے والا ہے۔ مگر اس نے عجیب حرکت کی۔ سلیب پر کھڑے کھڑے میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے دیوار کا سہارا لیا اور میلے کپڑے سے ڈھکی ہوئی تلے اُوپر رکھی ــــ تینوں لاشوں پر جوتوں سمیت چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لاشیں ابھی سخت نہیں ہوئی تھیں اِس لیے اُسے چڑھنے میں مشکل پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا وہ بُری طرح ڈگمگانے لگا ہے۔ ایک بار گرنے کو ہوا تو اُتر آیا، میری طرف دیکھتے ہوئے کھسیانی ہنسی ہنسا اور دوبارہ لاشوں کے پیروں کی طرف سے چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر دیوار کا سہارا لیے وہ سب سے اُوپر والی لاش کی رانوں پر پیر جماتا، پیٹ پر سے ذرا سا اُچھل کر سینے پر کھڑا ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ وہیں سے کھڑے کھڑے اُس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا: "دیکھا جناب آپ نے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے بظاہر بے تعلّقی سے میری طرف پشت کر لی۔ لمحے بھر کو دیوار کی طرف منہ کیے خاموش کھڑا رہا۔ یا شاید وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ کہہ رہا تھا جو میں سُن نہ سکا۔ شاید وہ مجھے سُنا بھی نہیں رہا تھا۔ پھر وہ بالکل خاموش ہوگیا۔ اب اُس نے اپنے دونوں بازوؤں کو ڈنٹر پیلتے ہوئے پہلوان کی طرح خم دے کر بازوؤں پر اپنے بدن کا سارا زور ڈال دیا اور دیوار کی طرف اپنا چہرہ بڑھایا۔ وہ شاید وہاں کسی قسم کا نشان تلاش کر رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو دیکھا، وہ دیوار پر ٹنگی ایک فریم کی ہوئی پینٹنگ کی طرف جُھک رہا تھا۔ اُس نے فریم کے شیشے سے ایک بار اپنے ہونٹ مس کیے اور ہٹ گیا۔ پھر اُس نے گھوم کر میری طرف نظر کی اور فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ مسکرا چکا تو اُوپر والی لاش کے حلق پر دونوں پیر جمائے لمحے بھر کو کھڑا رہا۔ پھر جست لگانے

سے پہلے کسی ایتھلیٹ کی طرح اُس نے اپنے گھٹنے ذرا خم کیے اور زخرے پر سے فرش پر چھلانگ لگا دی۔
سلیب کے پاس کھڑے کھڑے اُس نے مجھ سے کہا "دیکھا جناب والا آپ نے تو یہ ہے!"
اُس کی یہ ساری کارروائی میرے لیے حیران کر دینے والی اور لایعنی تھی۔ میں خاموش رہا اور دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے پہلے توجہ نہیں دی تھی مگر اب جو پینٹنگ پر غور کیا تو دیکھا وہ کسی قسم کی خطاطی کا شاہ کار ہے۔ کسی نے بہت عرق ریزی سے نیلی زمین پر زرد رنگ استعمال کرتے ہوئے دو لفظ لکھے تھے "ہا ہا" میں نے دو لفظ اِس لیے کہے کہ لکھنے والے نے ایک "ہا" ایک طرح لکھا تھا اور دوسرا "ہا" دوسری طرح۔ بس دو ہی سِلے بل تھے "ہا ہا" اور اس شخص نے اتنی دِقّت اور مصیبت کے ساتھ سلیب اور لاشوں پر چڑھ کر اِس "ہا ہا" کو بوسہ دیا تھا۔ مگر کیوں دیا تھا؟ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔
میں بہت دیر سے بڑی بڑی باتوں پہ خاموش رہا تھا مگر یہ جاننا تو ہر صورت میں ضروری تھا کہ اُس نے جو کچھ کیا، کیوں کیا۔ اِس لیے میں نے پوچھ ہی لیا، وہ بولا "جناب والا! کیوں کا جواب تو کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ آپ کو پہلے بھی کوئی جواب نہ ملا ہوگا۔ تو اب تک آپ کو عقل آجانی چاہیے۔"
اُس نے حسبِ توقع عقل کو عُقَل کہا تھا۔ میں خاموش رہا تو وہ بولا "دیکھیں ناں جی۔ پیٹ تو سب کے ساتھ لگا ہوا ہے۔"
میں اِس کی بات سُن کر پیلا پڑ گیا۔ ہائیں! اِن باتوں کا پیٹ سے کیا تعلّق؟
وہ ہنسا "آپ سے دل مل گیا ہے جی اِس لیے بتائے دیتا ہوں ورنہ آپ تو جانتے ہیں کہ بڑ بڑ بڑ بڑ بڑ بڑ" وہ آگے بھی بہت کچھ کہتا رہا لیکن میں اس کے

ریڈیو کے شور میں کچھ بھی نہ سن سکا۔ سُن بھی لیتا تو کچھ زیادہ فرق نہ پڑتا اِس لیے کہ وہ عیاری کی باتیں کر رہا تھا اور چالاکی سے آنکھیں چلاتا ہوا مسکرا رہا تھا۔

اُس کے بارے میں اُڑائی گئی افواہیں مجھے اِس وقت حرف بہ حرف سچّی لگیں مگر بنا کسی ثبوت کے اُن افواہوں پر پُوری طرح یقین بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اُس نے اپنی صورت ٹوپی اور بنڈی تینوں چیزیں اِتنی نیکی سے پہن رکھی تھیں کہ افواہوں کو اُس سے منسوب کرتے کچھ عجیب سا لگتا تھا۔

مگر اُس نے ٹھیک کہا تھا کہ مجھے اس وقت تک عقل آجانی چاہیے تھی۔

میں اِس عرصے میں وھیل بیرو سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس سلیب کی طرف خاصا بڑھ آیا جس سے ٹیک لگائے وہ کھڑا تھا۔ اپنی عیّار باتوں کے جوش میں اُس نے دھیان ہی نہ دیا کہ میں اِتنا آگے بڑھ آیا ہوں، چنانچہ جب میں نے آنکھ بچا کر لاشوں پر ڈھکے ہوئے میلے کپڑے کا ایک کونا چٹکی سے پکڑا اور ایک ہی جھٹکے میں کھینچ کر اُسے دُور پھینک دیا تو وہ ہڑبڑا گیا اور کچھ کرنے کو ہوا مگر اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سلیب کی تینوں لاشیں میرے اور اُس کے سامنے کھُلی پڑی تھیں۔

میں نے دیکھا مُردوں کے بدن کے سب بال مونڈ دیے گئے تھے، حد یہ کہ پلکیں تک اُتار لی گئی تھیں اور مونڈنے والے نے اناڑی پن میں اُسترا چلاتے ہوئے جگہ جگہ سے لاشوں کے پپوٹے تک بھی کاٹ دیے تھے۔ ہر لاش کے رِب کیج کو ۸ کے ہندسے کی شکل میں کاٹا گیا تھا اور سب سینے حجّام کی کسوَت کی طرح کھُلے پڑے تھے۔

ایک ہی نظر میں اِس کارروائی کی وجہ سمجھ میں آجاتی تھی۔

میں نے دیکھا اُوپر کی لاش کے پھیپھڑے، معدہ، دل اور جگر وغیرہ جو

RIB CAGE

کبھی اندر سے کھینچ کر نکالے گئے ہوں گے، پھر واپس نہیں رکھے گئے تھے۔
اِس بنیادی کمی کو یوں پُورا کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ لاش کے جینی ٹلز تراش کر سینے میں بھر دیے گئے تھے جو اس وقت بڑی بے چارگی کے ساتھ ایک کونے میں پڑے نظر آرہے تھے کیوں کہ بیدار نہ ہوں تو بدنصیب جگہ ہی کتنی گھیرتے ہیں۔
میں نے اُن کی فطری جگہ پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہاں بڑی عیّاری اور منافقت سے چاندی کے ورق لگا کر جینی ٹلز کی غیر حاضری چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اِس کوشش میں اُنھیں بلاشبہ ناکامی ہوئی تھی۔

جب میں نے اُس کی طرف دیکھا تو شرمندہ ہونے کے بجائے وہ بڑی ڈھٹائی سے ہنسنے لگا، بولا: "میں نے جناب کو پہلے ہی ارض کیا تھا کہ پیٹ تو سب کے ساتھ لگا ہوا ہے۔"

وہ پھر پیٹ کا حوالہ دے رہا تھا۔ عرض کو "ارض" کہتے ہوئے بھی اُسے شرم نہ آئی۔

مَیں اُس سے کہنے کے لیے کوئی سخت بات سوچ ہی رہا تھا کہ وہ مصالحت کے انداز میں کہنے لگا: "دیکھو ناں جی ایک تو آدمی سسرال والوں سے بڑا آجز ہوتا ہے۔" اور وہ بے آواز ہنسنے لگا۔

میں نے نوٹ کیا کہ اسے جہاں عین کا استعمال کرنا چاہیے تھا وہاں الف کا بے دریغ استعمال کر رہا تھا۔ نیکی کا پول کھُل چکا تھا اِسی لیے اس کی عینیں ختم ہو چکی تھیں۔ اُس کی ہائے حُطّی کا بھی دُور دُور پتا نہیں تھا۔

خیر، وہ کہنے لگا: "دیکھو جناب سُسرال والوں کے ساتھ میل ملاپ سے رہنا پڑتا ہے۔ ایک ہی سالا ہے میرا۔ پوشش کا کام کرتا ہے۔ ایک بار بولا بھائی جی صوفے میٹریس میں بھرنے کے لیے مال نہیں ملتا۔ اِکنفّر کے بعد سے پٹ سن ملنا

بند ہو گیا ہے اور روٹی پڑتی ہے جی بہت مہنگی، تو آپ کو بھائی جی اَلّا تالا نے عزت دے رکھی ہے اور کہنے لگا بھائی جی آپ کی ذمہ داری میں جو سارا مال پڑا ہے وہ منایا ہی جاتا ہوگا۔ ہی ہی ہی، پھر کہنے لگا بھائی جی لاشوں کو فرق کوئی نہیں پڑے گا۔ بھلے ہی اُوپر بال ہوویں بھلے ہی نہ نہ ہوویں۔ ہی ہی ہی بڑا ہی مشکرا ہے۔ مگر بات صحی کہہ رہا تھا۔ ایں نا جناب؟ تو آپ سمجھ گئے نا جی۔ سسرال والوں کے ساتھ تو جی میل ملاپ کے ساتھ رہنا ہی پڑتا ہے۔"

اب وہ سلیب کے پاس سے ہٹ گیا تھا اور خوشامد میں ہاتھ ملتا ہوا میری طرف آرہا تھا: "یہ خادم جناب فِل حال آپ کی اور کوئی خدمت تو کر نہیں سکتا۔ یہ بتائیں جناب آپ کا کوئی مرگی شرگی کا فارم ہے؟ کوئی چڑیا شڑیا پلنے کا شوق ہے آپ کو بھی؟ تکلّف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اُس نے بازو لہراتے ہوئے مُردہ گھر کے پورے منظر کو اشارے میں لے لیا اور بولا: "دیکھیں ناں جناب! اِدھر کتنے ہی مَن بڑا خراب ہوتا ہے۔ پرندے وگیرہ بھی تو اُسی کی مخلوق ہیں جناب۔ خراب ہونے سے تو اچھا ہے یہ سب اُس کی مخلوق کے کام آجائے۔" اُس نے عقیدت کے ساتھ دیوار پر ٹنگی پینٹنگ کی طرف دیکھا اور نیکی کے ساتھ آہ بھری۔ "ہا ہہ! اگر جناب آپ اپنے ٹفن بکس کا ایک دو خانہ خالی کر دیویں تو جی بڑی مہربانی ہوگی۔ فِل حال تو جناب والا آپ کی بس یہی خدمت کر سکتا ہوں۔"

خود اپنے بارے میں اب یہ بتانا ضروری ہو گیا ہے کہ میں جلد مشتعل ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔ ہیجان اور تشدّد سے دُور رہنا چاہتا ہوں لیکن اِس وقت اُس کی باتیں سنتے ہوئے میں انتشار اور ہیجان میں کانپنے لگا اِس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ میں یہ جگہ چھوڑ دوں۔ میں نے اپنا ٹفن بکس اور تھرموس اُٹھایا اور

مُردہ گھر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ شخص میرا ارادہ بھانپ گیا تھا اس لیے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اب وہ بالکل بدلا ہوا آدمی تھا۔ اپنے سفید سفّاک دانتوں کی نمائش کرتا ہوا وہ میرے راستے میں کھڑا تھا اور جس طرف سے بھی مَیں دروازے تک پہنچنا چاہتا تھا وہ مجھ سے پہلے پہنچ کر میری راہ بند کر رہا تھا۔

میں پیدائشی خوف زدہ آدمی نہیں ہوں۔ مگر یہاں گزارے ہوئے وقت نے میرا پِتّا پانی کر دیا تھا۔ میں اپنے پائینچوں میں کھڑا کانپنے لگا۔ ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے ٹفن بکس اور تھرموس ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ یہ دہشت کا ٹے ٹُو تھا۔ اِس وقت مُردہ گھر میں اگر کوئی آواز تھی تو یہی تھی۔

اُس نے میرا خوف دیکھ کر فتح مندی کے ساتھ کئی بار ''ہا ہا'' کہا۔ یہ دیوار کی پینٹنگ والے سِلے بٹن تھے۔ کچھ ہی دیر پہلے اُس نے بڑی دِقّت اور عقیدت کے ساتھ انھیں چوما تھا۔ اب وہ انھیں میرے خلاف استعمال کر رہا تھا۔ میں پوری طرح گھِر چکا تھا اور دہشت کے ٹے ٹُو اور اُس کی '' ہا ہا'' کے درمیان کوئی بے ہمّتی کا فیصلہ کرنے ہی والا تھا کہ کسی نے ہلکے سے دستک دی۔

یہ باہر کی آواز نہیں تھی۔ کسی نے الماری کا پٹ تھپتھپایا تھا۔ کوئی الماری کے اندر تھا۔ مگر الماری کے اندر کون ہو سکتا ہے؟ مُردہ گھر کی الماریوں میں موت کے سوا کون ہوگا۔ کیا یہ میری سماعت کا دھوکا ہے؟ مگر نہیں وہ آواز پھر آئی۔ اِس مرتبہ اُس نے بھی وہ آواز سنی۔

اُس نے وہ آواز سُنی اور پِیلا پڑ گیا۔ وہ الماری کی طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ میں نے، جو اَب تک اپنے پائینچوں میں کھڑا لرز رہا تھا، اچھل کر اس کا رستہ روک دیا۔ اُسے ناپسندیدگی سے گھورتے ہوئے میں نے الماری کے پٹ سے کان لگا دیے۔ اندر کوئی سانس لے رہا تھا اور دستک دیے جا رہا تھا۔ کوئی تھا جو باہر

آنا چاہتا تھا۔ میرا دل مسرّت سے بھر گیا۔

مُردہ گھر میں میرے علاوہ کوئی اور بھی ہے جو زندہ ہے اور باہر آنا چاہتا ہے۔

یہاں کوئی اور بھی زندہ ہے اور جینا چاہتا ہے۔

شہرِ کوفے کا محض ایک آدمی

ایک ایسے آدمی کا تصوّر کیجیے جس نے کوفے سے امامؑ کو خط لکھا ہو کہ میرے ماں باپ فدا ہوں، آپ دارالحکومت میں ورود فرمایئے حق کا ساتھ دینے والے آپ کے ساتھ ہیں۔ اور وہ آدمی اپنے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اس بات پر ایمان بھی رکھتا ہو، مگر خط لکھنے کے بعد گھر جا کر سو گیا ہو۔

جیم الف ایسا ہی ایک آدمی ہے (بلکہ شاید یہ وہی آدمی ہے) جسے مسلم بن عقیل کے واقعے کی خبر ملی تو اس نے زانو پیٹ لیے، گریباں چاک کیا۔ بہت دیر تک روتا رہا —— پھر اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور سو گیا۔

اُدھر گواہی دینے والے آسمان خشم سچّوں نے نہرِ فُراتؔ کے کنارے خیمے گاڑے اور صبر کی تاریخ شروع ہوئی۔

جب دس ہزار دینار زادوں نے امامؑ کے مقابل صف بندی کی تو یہ آدمی زیتون کے روغن میں اپنی روٹی چُور چُور کر کھا رہا تھا۔ پاس ہی دودھ بھرے پیالے میں حلب کے خُرمے پڑے بھیگتے تھے اور شیشے کے ایک ظرف میں کوئی عرق تھا اور یہ ظرف برف سے زیادہ سرد ہو رہا تھا۔

خبر ملی کہ اشرار آمادۂ فساد ہیں تو اس آدمی نے روغن میں سَنے ہوئے دونوں ہاتھ طمانیت کے ساتھ اپنے چہرے پر مَلے اور کہنے لگا" امامؑ حق کے ساتھ ہیں اور

حق غالب آنے والا ہے۔" پھر اس نے ڈکار لی، امامؑ کو یاد کیا اور اُن کے لیے اور اُن کی جماعت کے لیے اللہ کی نُصرت طلب کی اور دستر خوان کے برابر پڑے تکیے سے ٹیک لگا لی، پھر وہیں کروٹ لے کر سو گیا۔

جب خبر آئی کہ بچوں پر پانی بند کر دیا گیا ہے تو روتے ہوتے اس نے اپنے ہاتھ کی ایک ضرب سے عرق کے ظروف اوندھا دیے اور پکار کر کہنے لگا کہ والئے افسوس! سگِ دنیا ابنِ زیاد نے اور اس کے زرخرید کتوں نے اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اس بار وہ بہت دیر تک رویا اور کرب و انتشار میں جاگتا رہا۔ کہیں صبح ہوتے ہوتے اُسے نیند آئی۔

پھر پتا چلا کہ ایک پاکیزہ خصلت جوان بچوں اور بیماروں کے لیے بھرا ہوا مشکیزہ لاتا تھا کہ بدخصالوں کے ہاتھوں شہید ہوا۔ یہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب کے اس نے ایک پہر نالہ و شیون کیا اور سینہ زنی کی اور اب کے بھوک اور پیاس اور نیند اس سے رخصت ہو گئے اور یہ سوچتا رہا کہ کچھ کرے، اس لیے کہ ان صادقوں کے لیے اس کا دل خون روتا تھا۔

سو اُس نے کچھ اور نہ کیا بس گڑگڑا کر دعا کی کہ بارِ الٰہا! تیرے محبوبؐ کی آل اپنے گھروں سے نکلی ہے اور تو جانتا ہے کہ یہ لوگ حق پر ہیں اور تو ہی اُن کا حامی و ناصر ہے ـــــــ پھر کیوں کہ اس تمام کاوش سے یہ کسل مند ہو گیا تھا اس لیے روتے روتے اس نے کچھ دیر کو آرام کیا اور دیوار سے ٹیکے ٹیکے سو گیا۔

پھر کسی نے پکار کر کہا کہ سگِ دنیا شمرِ ذوالجوشن نے کسی بھیانک جرم کے ارادے سے امامؑ کی طرف گھوڑا بڑھا دیا ہے۔ تب اور تب ہی یہ چیخ مار کر اٹھا ـــــــ یہ بالآخر اٹھا اور اس نے عجیب کام کیا کہ اپنے چھپّر کو سہارنے والی بَھتّونی جھٹکے سے اکھاڑ لی۔ اُسے گرز کی مانند گردش دیتا ہوا نہرِ فرات کی طرف

بڑھا اور حق تو یہ ہے کہ لمحے بھر کو اس نے یہ نہ سوچا کہ اس چھپر کے نیچے اس کی عورت اور اس کے بچے بیٹھے ہیں۔

بلاشبہ امامؓ کے لیے اس کی محبت حد درجے کی تھی۔

یہ چھپر کی تھونی اٹھائے دوڑا جاتا تھا اور شریروں، بدخصالوں، قاتلوں کے لیے اس کے پاس کلمات نا ملائم تھے اور کبھی کبھی یہ فحش کلامی بھی کرتا تھا اس لیے کہ سخت آزردہ تھا اور لگتا تھا کہ اُن ہزاروں سگانِ دنیا کو، کہ جو سچوں، گواہی دینے والوں کو قتل کرنے آئے تھے، یہ اپنی مغلظات سے پارہ پارہ کر دے گا۔ اس کی فحش کلامی کچھ عرصے تک جاری رہی پھر بند ہو گئی۔ کس لیے کہ آگے مقام ادب تھا۔ آگے وہ مُطہر سماعتیں تھیں جنھوں نے مقدس رسولؐ کو کلام فرماتے سُنا تھا۔

تو بس ایک لمحے میں اس کی وابستگی اور اس کے باطن کی سچائی نے ظہور کیا اور اس ایک لمحے میں کہ شمرِ نجس کا وار امامؓ پر ہوتا اور انسانی تاریخ کا سب سے بھیانک جرم سرزد ہو جاتا۔ اس ایک لمحے میں یہ شخص امامؓ اور قاتل کے درمیان کھڑا تھا ــــ پھر اس نے ایک دل ہلا دینے والا نعرہ سر کیا اور اپنی ٹیڑھی میڑھی لاٹھی سے ایسی ایک ضرب لگائی کہ شمر ذوالجوشن اپنے خَود کی نجس چوٹی سے اپنے مرکب کے زنگ آلود نعلوں تک ہل کر رہ گیا اور لکڑی ٹوٹ گئی۔

تب شمر نے گھوڑے کو مہمیز کیا اور اُسے، جو بہت تاخیر سے اور نہتا ہی اپنے ذی حشم مہمان کی سپر بننے آنکلا تھا ــــ اسے روندتا ملتا ہوا اپنے آخری جرم کی طرف بڑھ گیا۔ یہ شخص گرا ــــ دودھ، پنیر، شہد اور روغن زیتون اور تازہ خرمے سے پلا ہوا اس کا بدن امامؓ کے تصدق ہو گیا۔

اور پھر وہ آخری جُرم سرزد ہوا جس نے ترائی پر چمکنے والے سورج کو سیاہ کر دیا ــــ اور رات آگئی اور رات میں کسی وقت بلند قامت گھوڑوں پر سوار

حُر بن ریاحی کے قبیلے والے آئے اور صرف اپنے آدمی کا لاشہ اٹھالے گئے۔
اور پھر زمرّد اور یاقوت اور مشک اور عنبر کے بہتّر تابوت لے کر تاریخ آئی جس نے بہتّر آسماں شکوہ لاشے سنبھالے۔ اُن میں ایک سر بریدہ لاشہ صبر و رضا والے اور استقامت والے امامؑ کا تھا کہ جن کا قدم بلندی پر تھا سو انھیں بادلوں پر جگہ ملی۔
پھر سگانِ دنیا کے ورثا۔ اپنے مسخ شدہ حرام مردے کھینچ لے گئے اور میدان خالی ہو گیا۔
مگر یہ آدمی (کہ جس کی کہانی میں نے سنانی شروع کی ہے) یہ وہیں پڑا رہا۔ شمر کے گھوڑے کی لید میں سَنے ہوتے اس کے سری پائے، بھیجہ اور قیمہ وہیں پڑا رہ گیا جسے صبحدم چیونٹیوں کی پہلی قطار نے دریافت کیا اور آہستہ آہستہ منہدم کرنا شروع کر دیا ـــــــ اور یہ انہدام تا دیر جاری رہا۔
تو ایک ایسے آدمی کا تصوّر کیجیے جس نے امامؑ کو خط لکھا ہو اور خط لکھنے کے بعد گھر جا کر سو گیا ہو۔ مگر آخری لمحے میں اپنے باطن کی سچّائی اور اپنی وابستگی کا اظہار کرے اور عجیب طرح سے مقبول بارگاہ ہو۔ ایک ایسے آدمی کا تصوّر کیجیے۔۔۔۔۔
یہ آدمی جیم الف ہو گا۔ (جس کی کہانی میں اس وقت سُنا رہا ہوں۔)
مگر جیسے یہ چند سطریں لکھ کر میں نے سب سے پہلے سنائیں وہ جیم الف تو ایک چھوٹے سے ملک کے چھوٹے سے گھر میں لکھ لکھا کر اپنے چھوٹے سے کنبے کو پال رہا ہے۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی سُبک باتوں سے گاتی گنگناتی دُکھ سہتی ہوتی غزلیں بناتا ہے اور ایک چھوٹی زبان کے چھوٹے چھوٹی اشاعتوں والے جریدوں میں چھپوا دیتا ہے۔ بکّی روشنائی میں اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر خوش ہو لیتا ہے۔ مشاعروں میں گا بجا لیتا ہے۔۔ نہ کبھی اُس سے بڑے گناہ سرزد ہوتے نہ اس نے خیر کا کوئی بڑا

کام کیا۔ چھوٹی موٹی نیکیوں پر اور ہلکی پھلکی معصیتوں پر اس کا گزارہ ہے۔ میں نے سید الشہداؑ کے نام نامی کے ساتھ اس آدمی کا تذکرہ کرنے کی جسارت اس لیے کی کہ میں اس کی وابستگیاں بتا دینا چاہتا ہوں۔

تو سنیے بات کوئی پرانی نہیں ہے۔ یہ آدمی ایک بار کسی مشاعرے میں بلوایا گیا تو میزبانوں سے کہنے لگا "مجھے پیسے نہ دو۔ یہاں سے بیت اللہ قریب ہے مجھے عمرہ کرا دو۔ تمھارا کوئی زیادہ خرچ بھی نہ ہوگا۔" پھر عمرہ کرنے گیا تو طواف کرتے ہوئے بے ڈھنگے پن سے دھاڑیں مار مار کے رونے لگا (سمجھو تو اتنی عمر میں اس سے یہی ایک نیکی صادر ہوئی ہے) ـــــــ یا اسے اس کی بے بسی کہہ لو۔ کہہ رہا تھا: "میں نے حرم شریف میں دنیا کے پہلے مظلوم اور مستقیم آدمی سے لے کر فلسطینیوں تک سب کے لئے دعا کی اور روتا مجھے اپنی ضلالت اور بے بسی پر آتا تھا کہ میں اگر کربلا کے سن ہجری میں ہوتا تو اپنے گھر میں پڑا کلپتا رہتا۔ مجھ میں اتنی استقامت بھی نہ ہوتی کہ جلانے کی لکڑی کھینچ کر ہی ظالموں کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور گھوڑوں تلے روند دیا جاتا۔ کہنے لگا "دیکھ لو میں یا سر عرفات کے سن ہجری میں ہوں اور سولتے گالیاں بکنے اور دعائیں مانگنے کے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تو کسی جارح ٹینک کے سامنے جا کھڑا ہونے کی ہمت نہیں رکھتا۔ مجھے گھڑگھڑاتی ہوئی لوہے کی اس پٹی سے خوف آتا ہے جو مجھے بھر میں قیمہ بنا دیتی ہے .... مگر میں ضمیر کی اس گھڑگھڑاتی ہوئی آواز سے بھی قیمہ ہوا جاتا ہوں جو ہم میں سے اکثر کو سنائی دے رہی ہے"۔ اور آخری بات اس نے مجھ سے یہ کہی کہ بھائی میں بھی اور تم بھی اور ہم سب اصل میں اپنی مصلحت اور منافقت کے کوفے میں آباد ہیں اور حق کے لیے جنگ کرنے والی کسی مستقیم ENTITY سے آنکھ نہیں ملا سکتے، خواہ وہ استقامت کی سب سے بڑی علامت حسینؑ ہوں یا ہمعصر تاریخ کے فلسطینی۔

میں اس کا شانہ اپنے قلم سے چھوتا ہوں۔ یہ نائٹ بنانے کی رسم ہے۔ پہلے اس موقعے پر قلم کی جگہ تلوار استعمال کی جاتی تھی۔ تو میں اسے مایوسی اور بے بسی کا نائٹ مقرر کرتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں کہ پیارے جیم الف! ہمیں ہمارے پنیر اور روغنِ زیتون اور خرمے کھا گئے۔ اور پیارے جیم الف! چیونٹیوں کی پہلی قطار ہمیں دریافت کر چکی ہے کہ ہمارا انہدام کبھی کا شروع بھی ہو چکا۔

سو اب اپنے گھر جاؤ اور کھانا کھا کر آرام کرو۔

برُجِ خموشاں

میں ایک نو تعمیر عمارت میں ہوں۔

یہ ایک برُج سا ہے۔

برُج کسی نامقدّس ناہنجار ٹوٹم کی طرح ایک طرف جھک گیا ہے۔ ابتدا میں اُسے کُرّے کا مرکز قرار دے کر عموداً نصب کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا مگر بنیادی بددیانتی سے کام لیتے ہوئے اُسے ٹیڑھا گرایا گیا۔ پھر زمین کی کشش دوسری سب چیزوں پر حادی آگئی اس لیے برُج زاویہ قائمہ بنانے سے قاصر رہا اور ایک طرف جھکتا چلا گیا۔ جب یہ ہوچکا تو خاموشی کے ساتھ طے کیا گیا کہ اب اسے صرف کِریا کرم کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اس طرح زندوں کے لیے تعمیر ہونے والی عمارت کو برُجِ خموشاں بنا دیا گیا۔ اور یہ بات مجھ سے چھپائی گئی۔

مجھے برُج کے جھک جانے پر یا اس کے نئے استعمال پر یا بات کے چھپائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں۔

اب تو کسی چیز پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض اُسے کرنا چاہیے جس کے بس میں کچھ ہو۔ میرے بس میں کچھ نہیں ہے، صرف تماشائی ہونا میرے اختیار میں ہے اس لیے میں صرف تماشا دیکھ رہا ہوں۔

میں سر اُٹھائے برُجِ خاموشاں کے دہانے سے نظر آتے روشن آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ مُردار خور پرندوں کے غول روشن آسمان کے

مقابل آ کر اُسے ڈھک لیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بصری دھوکا ہو (ٹیلی وژن پر ابھی ابھی یہی کہا گیا ہے) مگر میں اپنی ہڈیوں میں محسوس کر رہا ہوں کہ ابتلا کا آغاز ہو چکا ہے۔

خواتین و حضرات! مجھے گمان ہے کہ میں کسی حد تک زندہ آدمی ہوں اور غلطی سے یہاں موجود ہوں کہ شاید یہ بُرج غلطی سے میرے گرد تعمیر کر دیا گیا ہے اس لیے اُمید کرتا ہوں کہ آپ کا روایتی خداوند مجھے اب چیخنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔

(ایک آدمی کی چیخ جس کے بعد سناٹا)

مرتبان آوازوں کا ایک ناٹک

میں ۔ ایک مرد، زندگی کرنے کی رقّت انگیز ۔ امنگ لیے ہوئے، حوصلے کے ساتھ سب عذاب جھیلتا ہوا، ہارتا ہوا۔

وہ ۔ ایک روحِ زندہ، "میں" کے لیے ایک چاہت، ایک دردمندی لیے ہوئے، جو کچھ ہو رہا ہے اس سے خوفـــزدہ، سوالوں سے بھری ہوئی، جواب لاتی ہوئی، معصوم۔

لِنچمین ۔ کرخت، غیرانسانی، روباٹ آوازوں والے راکھشس، جو اپنے زمانی تسلسل میں کبھی سفید، کبھی سُرخ، کبھی سبز رنگوں میں دستیاب رہے ہیں۔ یہ کسی بھی احساس کے بغیر محض ایذا پہنچانے والی ایجنسیاں ہیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں کہ ان کے بھیجے ہوئے عذاب کسی بے جان شے پر مرتکز ہیں یا کسی جاندار پر۔ یہ کسی نظریے کسی چیز پر یقین نہیں رکھتے، یہ تو بس چیزوں کو حاصل کرتے انھیں آخر وقت تک اپنے قبضۂ قدرت میں رکھنے یا حصول میں ناکامی پر انھیں پوری طرح تباہ کر دینے پر ایمان لائے ہیں۔

رَاوی ۔ ہر قسم کے اِنوالومنٹ سے بچنے والا (جیسے کہ سب راوی ہوتے ہیں)۔

(حاوی صوتی تاثر ۔ ہوا کا جھونکا ایک چٹیل میدان سے گزرتا ہوا طوفانی جھکّڑ بن جاتا ہے کیونکہ اس منظر میں اُس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں بس درختوں، عمارتوں، ٹیلوں سے خالی ایک میدان ہے۔ کبھی کبھی ہوا کا زور ٹوٹ بھی جاتا ہے تاہم ہلکی ہوا مسلسل چلتی رہتی ہے۔)

ROBOT INVOLVEMENT LYNCHMEN

راوی (خوف زدہ خفگی آواز میں، جو ہر کہانی کہنے والے کی پہچان ہے) یہ ایک خوبصورت منظر ہے۔ جلا وطنی کے تیسرے میل پر ایک وسیع و عریض میدان، درختوں اور عمارتوں سے خالی حدِ نظر تک تر و تازہ ہری دُوب سے ڈھکا ہوا۔ اور سامعین! اس مرغزار کے بیچوں بیچ خاردار تاروں سے ایک احاطہ کھینچ دیا گیا ہے اور احاطے کے بیچوں بیچ کھلے آسمان کے نیچے ایک آدمی کھڑا ہے، ایک صحیح و سالم آدمی۔ یہ احاطے کے عین وسط میں، کھلے آسمان کے نیچے۔۔ ۔۔۔۔ مگر نہیں! (راوی کی آواز خوف کی سسکی بن جاتی ہے) نہیں سامعین! اس کے سر پہ کھلا آسمان نہیں ہے کیونکہ پورے احاطے پر شفاف محدب شیشے کی چھت پڑی ہے ـــــ اور ـــــ اور یہ چھت خم کھاتے ہوتے دُہرے مجوف شیشوں کی چار دیواری پر ٹکی ہوئی ہے۔ خدایا! یہ تو ایک بہت بڑا ہوا بند مرتبان ہے اور اس ـــــ مرتبان کی استر کاری خاردار تاروں سے کی گئی ہے اور اس چوکور مرتبان کے بیچوں بیچ۔۔۔۔

میں۔ میں ہوں! میں!

راوی۔ جی ہاں جیسا کہ میں نے بتایا یہ آدمی کھڑا ہے۔ اور یہ اکیلا ہے۔

میں۔ نہیں میں اکیلا نہیں ہوں۔ وہ بھی ہے۔

وہ۔ ہاں، میں بھی ہوں ـــــ میں ـــــ ہوں۔

میں۔ وہ میرے ساتھ ہے ـــــ اس لیے کہ میں زندہ ہوں۔

راوی۔ (پریشانی کے ساتھ بے بس آواز میں، مگر مجھے تو خاردار احاطے کے مرتبان میں صرف تم نظر آ رہے ہو۔ عجیب بات ہے سامعین! میں۔۔۔ میں کسی جگہ میں

نہیں پڑنا چاہتا۔ میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ جی نہیں۔ خدا حافظ!

(گھبرائے ہوئے قدموں کی چاپ دور ہوتی ہے۔)

میں ۔ (پکار کر) سنو! احاطے میں تو صرف میں ہوں۔ وہ جو ابھی بولتی تھی میری موجودگی میں شریک ہے، میرے ساتھ ساتھ ہے اور آزاد ہے۔ وہ مجھ سے کلام کرتی ہے، مجھ سے پوچھتی ہے کہ ....

وہ ۔ تمہارے سب دن کہاں گئے؟

میں ۔ میرے سب دن میرے پاس ہیں۔

وہ ۔ پھر کیا پریشانی ہے؟

میں ۔ میری آکسیجن ختم ہوتی جا رہی ہے۔

وہ ۔ تو تم اِس مرتبان میں اپنی آکسیجن ساتھ نہیں لائے تھے؟

میں ۔ جلاوطنی کے تیسرے میل تک جتنی آکسیجن لا سکا تھا، لے آیا تھا۔ وہ ختم ہو گئی۔

وہ ۔ اور آکسیجن لے لو۔ کس کے پاس ہے؟

میں ۔ جو خاردار تاروں اور شیشوں کے باہر بھی ہیں اُن کے پاس ہے۔

وہ ۔ کون ہیں وہ؟

میں ۔ (خوف کی سرگوشی) شِش ـــــ آہستہ بات کرو، سُن لیں گے وہ لِنچمین ہیں مجھے لِنچ کر دیں گے۔

وہ ۔ ہُنہہ! میں نہیں ڈرتی۔ (چہکتی ہوتی آواز میں) اُوپر دیکھو۔ چھت کے پار سورج کس قدر بڑا ہے۔ آسمان کتنا نیلا اور کتنا قریب ہے۔

(طرنباک موسیقی کی ایک لہر روم روم سے گزر جاتی ہے)

میں ۔ (بے دلی سے) ہوں۔ مجھے معلوم ہے۔ شاید وہ مجھے بصَری دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں شاید اسی لیے یہاں چھت پر مُحدّب شیشہ لگا رکھا ہے۔

LYNCHMEN LYNCH

وہ ۔ بڑے شکی مزاج ہو۔ یہاں کب سے ہو؟

میں ۔ یہیں ہوں۔ ہمیشہ سے۔ یہ بھی ممکن ہے مجھے کہیں اَور سے لایا گیا ہو۔ یا ممکن ہے انھوں نے مجھے یہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا ہو.... (اُلجھ کر) پتا نہیں۔

وہ ۔ تم اِس جگہ کو نہیں پہچانتے؟

میں ۔ کیسے پہچان سکتا ہوں۔ اگر پہچاننے کے لیے دیکھنا چاہوں تو بے شک سر اٹھا کر دیکھ سکتا ہوں۔ مگر آسمان آسمان سب ایک جیسے ہوتے ہیں اور سورج ہر جگہ ہے۔

وہ ۔ تم اپنے آس پاس بھی تو دیکھ سکتے ہو۔

میں ۔ ہوں۔ دیکھ سکتا تھا۔ مگر انھوں نے یہ دیواریں دُہرے مجوف شیشوں سے بنائی ہیں۔ اِن دیواروں کے پار تو چیزیں اتنی چھوٹی دکھائی دیتی تھیں کہ پہچانی نہیں جاتی تھیں اس لیے میں نے باہر دیکھنا چھوڑ دیا۔ (کھسیانی ہنسی) اگر کوئی باہر سے مجھے دیکھ لے تو اِن شیشوں کے پار سے میں بھی اُسے بہت چھوٹا نظر آؤں (استہزائیہ ہنسی) مگر یہ اطمینان ہے کہ یہاں مجھے باہر سے دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ عجیب جگہ ہے۔

وہ ۔ پہلے کہاں تھے تم؟ کیا یہ وہی جگہ ہے جہاں تمھیں ہونا چاہیے؟

میں ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلے کہاں تھا اور اب کہاں ہوں یا یہ وہی جگہ ہے جہاں مجھے ہونا چاہیے۔

وہ ۔ تو پھر یہ کوئی اور جگہ ہے؟

میں ۔ (چیخ کر) مجھے نہیں معلوم۔ نہیں معلوم کہ یہ کوئی اور جگہ ہے یا یہ کوئی جگہ ہے بھی کہ نہیں۔

(اچانک ایک غیر انسانی، غیر زمینی موسیقی کی سنسناہٹ، مُردے ڈھونے

والی گاڑی کے پہیّوں کی چرچراہٹ اور دلدلوں سے اٹھتے ہوئے بلبلوں کا شور ہمیں بتا دیتا ہے کہ پنچمین آ گئے ہیں۔ ایک کٹی چہرہ، ہنسی کسی بھی قسم کی ذاتی توہین سے مبرّا مشینوں کی غیر شخصی استہزا کی طرح ابھرتی ہے اور الیکٹرونک بیپ بیپ کے ساتھ ایک کٹی چہرہ آواز کہتی ہے،)

پنچمین۔ یہ جگہ تو ہے، تم نہیں ہو (بیپ بیپ) جگہ تو ہے، تم نہیں ہو (بیپ)، تو ہے، تم نہیں ہو (بیپ) ہے، تم نہیں (بیپ)، نہیں۔

وہ۔ (خوف کی سسکاری) یہ کون تھا؟

میں۔ پنچمین۔

وہ۔ تمھارا شور سُن کر آ گئے ہوں گے؟

میں۔ (دانت پیس کر) انھیں کہیں سے آنا نہیں پڑتا۔ وہ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ کسی نہ کسی رنگ میں، کبھی سفید، کبھی سُرخ، کبھی سبز، وہ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ بس رنگ بدلتے رہتے ہیں۔

وہ۔ رنگ؟ رنگ کیوں بدلتے ہیں؟

میں۔ دھوکہ دینے کو۔ یہ ظاہر کرنے کو کہ اب جو آتے ہیں وہ، وہ نہیں ہیں جو پہلے تھے مگر وہ ہیں سب ایک ہی۔ بس اپنی بیپ اور اپنے رنگ بدلتے رہتے ہیں (گہری سانس)، کبھی سفید، کبھی سُر ...... (مشکل سے سانس لینے کی تیز آواز) س س ....

وہ۔ (تشویش) کیا ہوا؟

میں۔ میری آکسیجن ختم ہونے والی ......

وہ۔ آکسیجن ختم ہو گئی تو کیا کرو گے؟

میں۔ (مشکل سے سانس لیتے ہوئے) معلوم ... نہیں ... مجھے کچھ ... نہیں معلوم ...

دم گھُٹ رہا ہے.....

وہ ۔ اُن سے تھوڑی سی آکسیجن مانگ لو نا۔

میں ۔ آکسی جن کی..... یہ آخری ٹیوب بھی ..... یہ بھی انھوں نے ہی دی تھی۔

وہ ۔ تو اور لے لو۔

میں ۔ (مشکل سانسوں سے) بدلے میں..... بڑی بڑی چیزیں مانگتے ہیں۔

وہ ۔ تو دے دو۔

میں ۔ ..... اور۔ کیا دے دوں؟ ..... دیواروں کے پار دیکھنا چھوڑ ہی چکا۔ اب صرف آسمان کی طرف یا اپنے اندر دیکھتا ہوں..... (سانسیں بے قابو ہو جاتی ہیں)

وہ ۔ (چیخ کر) یہ بھی چھوڑ دو۔ دے دو، یہ بھی دے دو۔

میں ۔ پھر..... رہ ہی کیا جائے گا میرے پاس ...س ...س ...

وہ ۔ تمھارے پاس تمھارے سب دن رہ جائیں گے۔ یہ کیا کم بات ہے۔ سنو! آسمان کی طرف اور اپنے اندر دیکھنا چھوڑ دو۔ دے دو۔ یہ بھی دے دو۔

میں ۔ (سانس اکھڑ رہی ہے مگر لہجے میں بڑی چاہت ہے) آس مان..... اس قدر نیلا، اتنا قریب اور سورج ..... (چیخ کر) میں کیسے چھوڑ دوں؟ میرے تو اندر بھی یہی آسمان..... یہی بہت بڑا سورج ہے۔

وہ ۔ (التجا کرتے ہوئے) دے دو۔ چیزوں کو اُن کے اصل قامت میں دیکھو۔ اتنا بڑا سورج ۔ ایسا قریب آسمان ۔ یہ غیر منطقی ہے۔ اوپر دیکھنا، اپنے اندر دیکھنا چھوڑ دو۔ دونوں چھوڑ دو۔ (گھگھیا کر) سنو! تمھارے سب دن تمھارے پاس رہیں گے۔ یہ سورج دے دو۔ آسمان دے دو۔

میں ۔ (غیر انسانی چیخ کے ساتھ) آ آ آ آہ ہ ہ ..... ہم میں (ایک گہری سانس)

میرا دَم گھُٹ رہا..... ہا، ہائے۔

وہ ۔ (چیخ کر) دے دو۔ سب کچھ دے دو۔

[موسیقی کا تاثر جیسے ایک زبردست کرائسس گزر جاتے پھر سکون ہو جاتے]

میں ۔ (ہار مانتی ہوئی آواز) دے دیا۔ میں نے (گہری سانس) اپنا سورج، اپنا آسمان دے دیا۔

[وہی غیر زمینی موسیقی، اپنی سنسناہٹ، چڑچڑاہٹ اور ٹوٹتے بلبلوں کے شور کے ساتھ بیپ بیپ کرتی فیڈ ان ہوتی ہے اور کھنک کے ساتھ کوئی چیز آ گِرتی ہے]

میں ۔ (مسرت کی آواز) ہا ـــــ ہا ہا ـــــ واہ! آکسیجن کی ایک اور ٹیوب نئی ٹیوب انھوں نے اندر ایک اور ٹیوب اچھال دی ہے (خوب گہرے زندگی بخش سانس لیتا ہے) ایک غیر منطقی آسمان، ایک فریک سورج کے بدلے سودا برا نہیں۔ کیوں؟ ہُہہ! (فکر کے ساتھ) مگر یہ روشنی کو کیا ہُوا ـــــ یہ ـــــ یہ دن ہے یا رات؟ (چیخ کر) دن ہے یا رات؟ ـــــ اور یہ (دھاڑتا ہے) میرا ایک دن کس نے اُٹھا لیا (روتا ہے) میرے سب دنوں میں سے ایک دن کس نے اٹھا لیا۔؟

وہ ۔ (اُداسی سے) تم نے نہیں دیکھا؟ انھوں نے شیشوں اور خاردار تاروں کی دوسری طرف سے اپنے بالوں بھرے شفیق پنجے بڑھائے تھے اور ایک ہی حرکت میں آکسیجن کی ٹیوب پھینکتے ہوئے تمھارا ایک دن بھی اُٹھا لیا تھا۔

میں۔ (روہانسی آواز میں) زیادتی ہے، یہ زیادتی ہے۔ میں نے انھیں اپنا سورج اپنا آسماں دے دیا تھا۔ پھر یہ ـــــ یہ کیوں کیا انھوں نے۔ میرا ایک دن! مجھے تو اپنے سارے ہی دن عزیز ہیں۔ انھوں نے بدعہدی کی ہے۔ مجھ سے

دو دو وصولیاں کی ہیں ــــ یہ کمینہ پن ہے ــ حرمزدگی ہے ــ غلط ہے، یہ غلط ہے۔

وہ ۔ تمھی نے تو کہا تھا کہ وہ ینجمین ہیں۔ ینجمین کسی عہد کے پابند تو نہیں ہوتے۔

میں ۔ مگر اُن کا پہلا سودا تو ٹھیک تھا۔ میں نے دیواروں کے پار دیکھنا ترک کیا تھا، انھوں نے ایک ٹیوب دے دی تھی۔ تو اب ایسا کیوں کیا؟ پہلے ایسا کیوں نہیں کیا تھا؟

وہ ۔ اپنا اعتبار قائم کرنے کو ــــ تمھیں اپنا گاہک بنانے کو اور اب ــــ تم اُن کی ضرورت نہیں ہو، وہ تمھاری ضرورت ہیں۔ سودا تمھارے ہاتھ سے نکل گیا۔

میں ۔ (دُکھ کے ساتھ) میرا ایک دن میرے ہاتھ سے نکل گیا ــــ اور آسمان اور سورج بھی ــــ باہر کے سارے منظر بھی ــــ خدایا!

وہ ۔ تمھیں آکسیجن تو مِل گئی نا۔

میں ۔ (مری ہوئی آواز میں) ہاں ــــ اور مجھے آکسیجن ملتی رہے گی ــــ ہر بار ایک ٹیوب آکسیجن کے بدلے وہ مجھ سے میرا ایک دن لے لیا کریں گے۔

وہ ۔ بہت سے دن ہیں تمھارے پاس۔ بہت سے دن ہیں۔

میں ۔ (ائی رَو میں) میرا ایک دن لے لیا کریں گے یہاں تک کہ میں کسی دن۔۔۔ اور وہ رات ہی ہو گی۔۔۔۔۔ میں کسی رات بے دن اور بے آکسیجن ہو جاؤں گا ــ دیکھنا یہی ہو گا۔

[موسیقی کا ایک نوٹ سوئی کی نوک کی طرح چبھتا ہوا بیدار ہوتا ہے]

وہ ۔ (سرگوشی) خاموش ہو جاؤ!

میں ۔ یہ اب کیا ہے؟ سوئی کی نوک کی طرح چبھتی ہوئی یہ روشنی اُوپر کے اندھیرے

NOTE

سے اُتر کر آ رہی ہے۔ کیوں؟

وہ ۔ یہ سورج تو نہیں ہو سکتا۔

میں ۔ سورج کیسے ہو سکتا ہے ــــ وہ تو میں ترک کر چکا ــــ اور سورج سوئی کی نوک کی طرح نہیں اترتا تھا ــــ مجھے یاد ہے ــــ وہ تو پورا آسمان اُجال دیتا تھا۔ یہ تو باہر کے سیاہ مخمل میں ایک سوئی کی نوک بیدار ہوئی ہے اور یہ ــــ (خوف کی سسکی) ۔ یہ میری طرف آ رہی ہے۔ [موسیقی کا یہ نوٹ سنسناتا ہوا تکلیف دہ حد تک چیخنے لگتا ہے] یہ چھت کے شیشے سے اُتر کر میری طرف.... اوہ [ایک زبردست الیکٹرونک لیش، ابلیس کے ہنٹر کی طرح چٹختا ہے، اس نوٹ کے سرے پر ایسی ایک آواز ہے جیسے سُرخ لوہے کو تیزاب میں بجھا دیا گیا ہو] یہ لیزر شعاع تھی جو سورج کی بد دعا کی طرح گرجتی ہوئی اُتری اور....

وہ ۔ کچھ جل رہا ہے۔ کیا جل رہا ہے؟

میں ۔ (خوف کی بے چارگی میں) اوووو۔ اس نے ۔ لیزر شعاع نے میرے پیروں کے پاس کی زمین جلا دی۔

[سوئی کی نوک جیسا چبھتا ہوا نوٹ پھر بیدار ہوتا ہے]

وہ ۔ روشنی کا ایک خدنگ پھر بیدار ہوا ہے ــــ دیکھو ــــ اوپر دیکھو۔

میں ۔ (آواز میں لرزش ہے) ہاں۔ آواز سن رہا ہوں۔ اوپر نہیں دیکھ سکتا۔ اب صرف جھلسی ہوئی زمین کی طرف ہی دیکھ سکتا ہوں۔ یاد نہیں ہے؟ میرا اُوپر دیکھنا موقوف ہوا [آواز کا خدنگ سنسناتا ہوا چیخنے لگتا ہے ۔ الیکٹرونک کوڑا لشکتا ہے۔ سُرخ لوہا تیزاب میں بجھتا ہے۔ 'میں' بھیانک چیخ مارتا ہے] میرے پیر ــــ پیر میرے پیر۔

ELECTRONIC LASH LASER

وہ ۔ گوشت جلنے کی بُو کہاں سے آ رہی ہے؟

میں ۔ (روتا ہے) میرے پیروں کی دسوں انگلیاں جلا دیں۔ جلا دیں۔ اووو و۔ ہو وو ـــــ ہو ع ہو ع (اُلٹیاں کرنے کی آواز گریے پر حاوی آجاتی ہے)

میرے پیع ـــــ پے پے پے [آواز کا خدنگ سنسناتا ہوا چیخنا شروع کرتا ہے پھر اچانک رُک جاتا ہے]

وہ ۔ حوصلہ رکھّو اب کچھ نہیں ہوگا۔ حوصلہ رکھّو۔ انھوں نے زاویہ بدل دیا ہے۔ اپنے مہربان پنجے بڑھا کر انھوں نے چھت کا زاویہ بدل دیا ہے۔ سکون سے کھڑے رہو ـــــ اب کچھ نہیں ہوگا۔

میں ۔ (بوکھلایا ہوا ہے) کیا؟ ـــــ کچھ نہیں ہوگا؟ میں ـــــ مگر میرے پیر آگ نے گلا دیے۔ میں اب صرف ٹخنوں تک ہوں۔ (چیخ کر) میں اب ٹخنوں سے شروع ہوتا ہوں۔

وہ ۔ کھڑے رہو۔ ٹخنوں سے اُوپر تو تم سالم ہو ـــــ کیا یہ کم بات ہے؟

میں ۔ (کھسیا کر ہنستا ہے، پھر اطمینان کا سانس لیتا ہے) ہاں ہاں۔ چلو غنیمت ہے۔ ٹخنوں سے اُوپر تو میں پورا ہوں ـــــ کوئی زیادہ ـــــ زیادہ فرق تو نہیں پڑا (ہنستا ہے)

[وہی غیر زمینی موسیقی جس میں مُردے ڈھونے والی گاڑی کے پہیّوں کی چرچراہٹ دلدلوں سے اُٹھتے بلبلے اور بیپ بیپ کی آوازوں کے ساتھ ایک روباٹ ہنسی بھی شامل ہے "میں" کی ہنسی پر سُپرامپوز ہوتی ہے]

میں ۔ ہہہ! وہ آگئے!

وہ ۔ وہ موجود ہیں۔ تمھی تو کہہ رہے تھے کہ وہ جاتے کہیں نہیں۔

میں ۔ (سرگوشی میں) یہ ـــــ یہ کیا ہو رہا ہے! وہ میرا ایک دن اُدھار رہے۔

SUPERIMPOSE

ہیں ۔ (چیخ کر) انھوں نے میرا ایک دن اور اٹھا لیا ـــــ میرا ایک ..... (خود اپنے منھ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے)

وہ ۔ (سرگوشی) ہاں۔ یہی دانش مندی ہے۔ منھ بند رکھو ورنہ وہ ایک دن اور اٹھا لیں گے۔

میں ۔ مگر کیوں؟

وہ ۔ انھوں نے چھت کا زاویہ تمھارے حق میں جو بدل دیا تھا۔ تمھیں لیزر شعاع سے جو بچایا تھا۔ اُس کی اُجرت تو وصول کریں گے۔

میں ۔ (مری ہوئی آواز میں) ہاں ـــــ ہاں ـــــ میں ممنون ہوں۔

وہ ۔ کہو مت! وہ یہ بات جانتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنی مہربانی کے صلے میں تمھارا ایک دن اور اٹھا لیا۔

میں ۔ پروا نہیں میرے پاس ابھی بہت سے دن ہیں۔

وہ ۔ یہ بھی نہ کہو..... سُن لیں گے۔

میں ۔ (مایوسی سے) انھیں معلوم ہے [سوئی کی طرح چبھتا ہوا نوٹ چیختا ہے، الیکٹرونک کوڑا لشکتا ہے۔ آواز کے بہرے پر تیزاب میں سُرخ لوہا بجھتا ہے] ہا آآ ئے پنڈلیاں ـــــ میری پنڈلیاں (روتا ہے) بچاؤ۔ مجھے اس سے بچاؤ۔ [سنسناہٹ بیدار ہو کر درمیان سے اچانک منقطع کر دی جاتی ہے] ہائے ـــــ ہا آآآ۔

وہ ۔ دیکھا چھت کا زاویہ پھر بدل دیا انھوں نے ـــــ وہ تمھیں مارنا نہیں چاہتے۔ زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔

میں ۔ (روتا ہے) ہاں ـــــ ہاں۔ میں ممنون ہوں ـــــ شکریہ اُن کا ـــــ وہ ـــــ اپنی مصلحتیں وہی خوب جانتے ہوں گے ـــــ مگر وہ مجھے کیوں زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔

کیوں ؟ دیکھو اب تو میں (روتا ہے) میں اب پنڈلیوں تک رہ گیا ہوں۔

وہ۔ (سمجھاتے ہوئے) یوں نہ سوچو ـــ دیکھو ـــ پنڈلیوں تک ہی سہی، تم ہو تو۔ تمھارا ہونا ہی بڑی بات ہے۔ سمجھے؟

میں۔ ہاں ـــ ہاں ہاں ـــ میں ہوں تو ـــ اور ـــ دیکھو (ہنستا ہے) اب کے انھوں نے لیزر شعاع روکی لیکن اس مہربانی کے بدلے میں میرا ایک بھی دن نہیں اٹھایا ـــ (گلوگیر آواز میں) میں اُن کی اس شفقت کا بدلہ کس طرح اتار سکتا ہوں ـــ سنو ـــ میں اُن کے اس کرم کے صلے میں اپنا ایک دن پیش کرتا ہوں۔

وہ۔ (تیز سرگوشی) ٹھہرو ـــ جلدبازی نہ کرو۔

میں۔ (کھسیائی ہوئی ہنسی) کوئی حرج نہیں۔ میں اپنا ایک دن خود سے پیش کر رہا ہوں۔ [غیر زمینی سنسناہٹ، مُردے ڈھوتے والی گاڑی کے پہیّوں کی چرچراہٹ کے ساتھ بلبلوں کی آواز اور بیپ بیپ شروع ہوتی ہے۔] وہ اپنے پنجے بڑھا رہے ہیں۔ میرا ایک دن کا عطیہ وصول کرنے کے لیے وہ اپنے شفیق پنجے بھیج رہے ہیں نا؟

وہ۔ (گمبھیرتا کے ساتھ) ہاں ـــ وہ اپنے بالوں بھرے پنجے بڑھا رہے ہیں اور ایک دن نہیں ـــ انھوں نے تمھارے دو دن اٹھالیے ہیں۔

میں۔ (الجھن کے ساتھ) دو؟ کیوں؟

وہ۔ کیا خبر؟ تمھی تو کہتے ہو کہ وہ اپنی مصلحتیں تم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔

میں۔ (حیران ہے) کمال ہے ـــ میں نے تو اپنا ایک دن پیش کیا تھا..... (چیخ کر) وہ دھوکے باز ہیں، منافع خور ہیں۔

وہ۔ (سرگوشی، خاموش رہو! کیا کرتے ہو (نِچمین کی آمد کی موسیقی) انھوں نے

ایک ساتھ تمھارے کئی دن اٹھا لیے۔

میں ۔ میں... میں ان خبیثوں سے بیزار ہوں۔ ان سے برأت کا اظہار کرتا ہوں (چیخ کر) میں ان سے نفرت کرتا ہوں ـــــ نفرت کرتا ہووووں۔

[اب کے سوئی کی طرح چبھتا ہوا موسیقی کا جو نوٹ بیدار ہوا ہے اُس میں بادلوں کی گرج بھی شامل ہے جو اپنے مہیب الیکٹرونک کوڑے سے وار کرتی ہے۔ اس مہلک وار کے پسِ پردہ ذبح ہوتے ہوئے ایک ہزار آدمیوں کی آواز ہاہا ـــــ ہاہا ـــــ ہاہا کہہ رہی ہے۔ یہ بَین اور ماتم کی پتّا پانی کر دینے والی آواز ہے]

وہ ۔ (چیخ مارتی اور رونا شروع کر دیتی ہے) انھوں نے گردن سمیت تمھارا سر اُڑا دیا تھیں ـــــ تمھیں تو خاموش رہنا تھا ـــــ اب تو ـــــ تم پنڈلیوں سے شانوں تک ہو...... بس اپنی پنڈلیوں سے اپنے شانوں تک کھڑے ہو۔

[ایک ہزار ذبح ہوتے ہوئے آدمیوں کی ہاہا کار دھیرے دھیرے فیڈ ہو جاتی ہے۔ مَیں کی بہت ہی کمزور آواز جیسے کسی غار سے اُبھرتی ہے وہ اب آخر تک اسی طرح سُنائی دے گی]

میں ۔ درست ۔ ٹھیک ہے ـــــ انھوں نے سر اُڑا دیا ہے اور میں اپنے بازوؤں کو بھی اپنے شانوں سے الگ ہوتے ہوتے محسوس کر رہا ہوں اور میں رانوں تک پگھلتا جا رہا ہوں۔ (کوئی چیز بھَپ کی آواز سے گرتی ہے) یہ میرے دونوں بازو گِر گئے۔ الگ ہو گئے شانوں سے.... اب زمین پر پڑے جلتی ہوئی مٹّی کے ساتھ معدوم ہو رہے ہیں ـــــ شاید ہی بچیں ـــــ میں دیکھ رہا ہوں دونوں کو کہنیوں تک تو آگ نے چاٹ لیا۔ (غیر انسانی ہنسی ہنستا ہے) میں اب زیادہ قریب سے دیکھ

سکتا ہوں۔ کیوں کہ رانوں تک تو ختم ہو گیا ـــــ اب اپنے وسط سے
شروع ہوتا ہوں ـــــ (ہنسی) زمین کو زیادہ قریب سے دیکھنے کی سہولت
مل گئی ہے مجھے۔

وہ ۔ (ہچکیاں) انھوں نے تمھارے سب دن اٹھا لیے ۔ مجھے جانا ہوگا ۔ اب
جانا ہی ہوگا۔

میں ۔ نہیں ۔ (گھگھیاتا ہے) نہیں ـــــ مت جاؤ (روتا ہے) میری یہ نئی
پہچان تو دیکھ لو ـــــ میرے دنوں کا غم نہ کرو ـــــ بازو میرے راکھ ہوتے
لیکن دو پنجے تو ہیں، مضبوط سیاہ بالوں سے ڈھکے ہوئے دونوں پنجے۔
انھیں آگ نے نہیں جلایا ـــــ دیکھو ـــــ اپنی بے تاب انگلیوں کی حرکت سے
زندہ یہ دو پنجے ہیں جو چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں ۔ انھیں پکڑ سکتے ہیں ۔
بے شمار چیزوں کو ـــــ چیزوں ـــــ چیزوں ـــــ چیزوں کو پکڑ سکتے ہیں ۔
حاصل کر سکتے ہیں ـــــ دیکھو مٹی کی آگ بجھ گئی ۔ تم کہاں چلی گئیں ـــــ
میری نئی پہچان تو دیکھتی جاؤ ۔ کہاں گئیں ـــــ دیکھو دو پنجے ہیں ـــــ
اور ایک مشک نافہ جو میرا پنجر توڑ کر، مجھے لیے ہوتے زمین پر جا گرا تھا اور
اب نئی زندگی کے نئے امکانات سے پارے کی طرح لرز رہا ہے .....
اب تو میں مکمل ہوا ہوں ۔ اس مرتبان کی پہنائی میں آج میں مکمل ہوا ہوں ۔
ہاں ـــــ میں تمھیں دیکھ رہا ہوں ـــــ میں نے تمھیں دیکھ لیا ہے ـــــ
ایک روشن غبار کی طرح تم شیشے کے اس حصار میں گشت کر رہی ہو ۔ چھت
اور دیواروں سے بے تابانہ لپٹتی ہوئی ۔ باہر جانے کا راستہ ڈھونڈتی ہوئی ۔
اوں ہنک! راستہ کوئی نہیں ۔ یہیں میرے پاس رہو ۔ میری نئی تکمیل میں
میرے پنجوں، میرے مشک نافے کی پہچان میں رہو ـــــ زندگی! ۔ میرے

ساتھ رہو ـــــ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ شیشے میں کوئی درز نہیں جو تمھیں راہ دے
لوٹ آؤ ـــــ لوٹ آؤ ـــــ (چیختا ہے) زندگی! زندگی!

[شیشہ ٹوٹنے کا زبردست چھناکا سنائی دیتا ہے۔ ساتھ ہی کسی پرندے کے اڑنے کی آواز دور ہوتی ہوئی ـــــ کو ابھرتا ہے ـــــ ڈوب جاتا ہے]
چلی گئی! (چیختا ہے) شیشے کا قفس توڑ کر چلی گئی اور..... (غیر انسانی ہنسی) اور مجھے بھی آزاد کر گئی۔ (شیشے کی کرچیاں ٹوٹتی جاتی ہیں جیسے کوئی انھیں روندتا ہوا جا رہا ہے)۔ میں آزاد ہوں۔ درختوں ٹیلوں عمارتوں سے خالی ہری دوب سے ڈھکے ہوئے اس مرغزار کے پھیلاؤ میں ـــــ میں آزاد ہوں۔ خاردار تاروں شیشوں سے ترتیب دیا ہوا میرا قفس راکھ ہو گیا ـــــ میں اب اپنے پنجوں اور اپنے مشک نافے کی توانائی سے ہری ہری گھاس پر دور دور تک لڑھکنے پر قادر ہوں۔ کوئی روک نہیں ـــــ میں ہری ہری گھاس کو جھلستا، بدرنگ لیس دار مادّے کی لکیر بناتا حدِّ نظر تک لڑھکتا ہوا جا سکتا ہوں۔ گھاس میں چھپے اپنے گمشدہ دنوں کو کہ شاید اپنے نئے دنوں کو ڈھونڈ کر لا سکتا ہوں۔ میں دوسری بہت سی چیزوں چیزوں چیزوں چیزوں کو حاصل کر سکتا ہوں۔ پکڑ سکتا ہوں بہت سی چیزیں چیزیں چیزیں۔ جی ـ [وہی مہلک سنسناہٹ جو مردہ گاڑیوں کے پہیوں کی چرچراہٹ اور دلدلوں سے اٹھتے بلبلوں اور ہیپ ہیپ سے مخصوص ہے اور پنچمین کی آمد کا پتا دیتی رہی تھی اب دانشگاف انداز میں شروع ہوتی ہے۔ اس میں راکھشسوں کے غیر شخصی استہزائی قہقہے ہیں جن میں مَیں کا قہقہہ شامل ہو جاتا ہے] ہاہ ـــــ ہا ہا یہ تم ہو پنچمین! پیارے پنچمین تم ہو؟ میں سمجھا تھا (ہنستا ہے) میں سمجھا تھا میں آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ (ہنستا ہے، تمھارے یہ بالوں بھرے شفیق پنجے سیاہ

چپچپے سمور کی یہ غلیظ گیندیں، تمھارے مُشک نافے جن پہ چاہت اور خوف کی نیلی وریدوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہ تم ہو۔ ہاہ ہا ہا ہا ہا یہ من موہنی شکلوں والے۔ میری نئی پہچان والے۔ میری نئی تکمیل کے عکس۔ یہ تم ہو۔ تم ہو عوع عوع (اُلٹیاں کرتا ہے، تھوکتا ہے) یہ میں ہوں کہ تم ہو۔ میں تم سے کچھ الگ تو نہیں۔ کوئی دوسرا تو نہیں۔ وہ چلی گئی جو مجھے تم سے الگ رکھتی تھی۔ وہ چلی گئی (روتا ہے) وہ گزر گئی۔ وہ چلی گئی۔ تو اَب ہم کیوں نہ دائرہ دار رقص کریں۔ کیوں نہ کریں رقص کہ وہ چلی گئی۔

(ایک UNHOLY رقص کی موسیقی جو اسی بیپ بیپ، اسی تِرّاہٹ اور دلدلوں سے اُٹھتے بُلبُلوں سے مُرتّب ہے، شروع ہوتی ہے۔ گھناؤنے قہقہوں اور سِسکیوں پہ یہ رقص ختم ہوتا ہے بس ایک بار گھٹی ہوئی متاسف آواز) وہ چلی گئی۔ وہ گزر گئی۔

(جیسا کہ آخر میں سب آوازیں ڈوب جاتی ہیں۔ یہ آواز بھی ڈوب جاتی ہے)

کورَس   دودھناتھ سنگھ کی کہانی

ادھر کئی برسوں سے وہ ایک طویل پرچھائیں کا پیچھا کر رہے تھے۔ بڑی محنت سے اُنھوں نے اِن برسوں کا شمار کیا تھا اور چوری چھپے اپنی پسلیوں پر سیاہ لکیریں بنا بنا کر اِن کا حساب رکھا تھا اور جیسے جیسے یہ تاریک برس بڑھتے جاتے ویسے ویسے اِن لکیروں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ کبھی کبھی غسل سے پہلے بند غسل خانوں میں وہ اِن لکیروں کو دیکھتے تھے اور بلا کسی وجہ کے کانپنے لگتے تھے۔ پانی چاہے ٹھنڈا ہوتا یا گرم یہ کپکپاہٹ جاری رہتی۔ پھر چاندنی میں چمکتے ہوئے دریا کے کنارے، یا کسی ریگستانی کیمپ میں یا کسی وادی میں وہ سب ننگے بدن اکٹھا ہوتے اور ایک دوسرے کی پسلیوں پر کھنچی سیاہ لکیروں کا شمار کرتے تھے۔ اس سے ہوتا یہ تھا کہ وقتی طور پر اُنہیں خوف سے نجات مل جاتی تھی۔ پھر اچانک وہ اپنے کپڑے پہن لیتے اور دوبارہ اس پرچھائیں کا پیچھا شروع کر دیتے۔ ہم دونوں، میں اور میرا دوست بھی اُن کے ساتھ تھے۔

میں نے دوست سے پوچھا: "یہ لوگ کیلنڈر سے حساب کیوں نہیں لگاتے؟"

"کہنے لگا: "کیلنڈر پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔"

"تو کیا اِن لکیروں پر بھروسا......؟"

"شش!"

میں نے پوچھا، "وہ اپنی پیشانیوں پر لکیریں بنا کر حساب کیوں نہیں رکھتے؟"

"ممکن ہے اُنھیں بوڑھے نظر آنا اچھا نہ لگتا ہو۔"

"میرے خیال میں تو وہ سبھی شادی شدہ ہیں۔"
"تم بھی برہمچاری نہیں ہو۔"
"میں۔ میں کہتا ہوں۔ یہ۔ یہ اسٹیبلشمنٹ۔ سازش۔ قتلِ عام۔ مَیں مَیں اِن سب کے لیے......"
"ہمیں ادھورے جملوں میں بات نہیں کرنی چاہیے۔"
"اگر میری آتما نشٹ نہیں ہوئی ہے تو سُنو، میں کہتا ہوں، یہی سچ ہے۔"
"تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تمھاری آتما کا کوئی وجود ہے۔"
"میں کہتا ہوں اِس طویل پرچھائیں کا تو قطعی کوئی وجود نہیں ہے۔"
"انھوں نے طویل پرچھائیں کو صرف اپنے لیے زندہ رکھا ہے، وہ اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔"
"اور تم اُن کے ساتھ ہو؟"
"ہاں۔ ہم اُن کی پیروی کر رہے ہیں۔"
"وہ اپنا کام رات ہی میں کیوں شروع کرتے ہیں۔"
"انھیں کوئی کام نہیں ہے۔"
"اچھا چلو۔ ہم پچھلتے جا رہے ہیں۔"
"ہمیں خاموش رہنے کی عادت اختیار کرنی چاہیے۔"
"میں تو بس کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتا تھا۔"
"انھیں کسی فیصلے پر نہیں پہنچنا۔"
"تم بھی یہی کرنا چاہتے ہو؟"
"ہمیں ان کی پیروی کرنی چاہیے۔"
"میں جانتا ہوں میں پیچھے رہ جاؤں گا.. اِسی لیے میں نہیں جانا چاہتا۔"
"تو تم کوئی ثبوت چھوڑے بنا مر جانا چاہتے ہو؟"

"اوہ! آتما کا ثبوت، موت کا ثبوت، زندگی کا ثبوت، اور ثبوت کا ثبوت اور ثبوت اس بات کا کہ...."

کہنے لگا: "ہمیں جلدی کرنی چاہیے..... وہ ہمیں وارننگ دے رہے ہیں۔"

پھر اچانک وہ ایک جگہ رک گئے۔ یہ شاید کسی اسکول کے پچھواڑے کا میدان تھا۔ قریب ہی اینٹوں کا ایک بھٹّا تھا۔ اس کے آس پاس کی مٹّی کھود لی گئی تھی اس لیے وہاں بہت سے گڑھے پڑ گئے تھے۔ ان گڑھوں کے کنارے چھوٹی چھوٹی قطاروں میں مُڑی ہوئی ٹانگوں والے بچّے اکڑوں بیٹھے حوائج ضروری سے فارغ ہو رہے تھے اور انھیں بہت سے سُوَر پریشان کر رہے تھے۔ یہ سُوَر کریہہ آوازیں نکالتے ہوئے بچّوں کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ بچّے ہنستے تھے اور اُنھیں پتھر مارتے تھے۔ بھٹّے کے قریب ہی ایک کنواں تھا۔ کنویں میں نیچے تک لوہے کی سیڑھیاں چلی گئی تھیں۔ کچھ اور بچّے سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے تھے اور چُلّوؤں میں پانی بھر بھر کر نیچے سے اوپر ایک دوسرے کو دیتے جاتے تھے۔

پرچھائیں کا پیچھا کرنے والوں کے سرغنے نے پوچھا: "کیا تم رات میں اسکول جاتے ہو؟"

بچّوں نے ترنت سوال جڑ دیا: "کیا تم رات میں اپنی دوڑ لگاتے ہو؟"

سرغنے نے مسکراتے ہوئے پوچھا: "رات کہاں ہے؟"

"اسکول کہاں ہے؟"

"تم بچّے یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم تمھارے لیے چُلّو بھر پانی لا رہے ہیں۔"

اس بات سے وہ بہت خوش ہوئے اور انھیں بچّوں پر ترس آنے لگا کہ آخر اتنے ذہین بچّوں کو کنوؤں میں اور سُوَروں کے درمیان کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اُنھوں نے فیصلہ کر لیا کہ پرچھائیں کا تعاقب دوبارہ شروع

ہونے تک وہ اپنا وقت بچّوں کو تحفّظ دینے میں لگائیں گے۔ چنانچہ وہ سُوروں پر پل پڑے۔ بچّوں نے بڑی بڑی خوف زدہ آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ اُن کی پتلی پتلی ٹانگیں اکڑ گئیں اور آنتیں سخت ہو کر سکڑنے لگیں۔

میں نے آہستہ سے اپنے دوست سے کہا "دیکھا، یہ سُوروں سے نجات پانا نہیں چاہتے۔"

وہ سرگوشی میں بولا "کون سُوروں سے نجات پانا چاہتا ہے۔"

"یہاں کے لوگ بڑے غیر ذمہ دار معلوم ہوتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ صرف سُوروں کو بچّوں کے فُضلے سے رابطے کی اجازت ہے۔"

"انھیں گولی سے اُڑا دینا چاہیے۔"

اُن کے سرغنے نے مجھ سے پوچھا "کیا تم یہاں کے لوگوں کو جانتے ہو؟"

اب اُنھوں نے کنوئیں کی دیواریں توڑنا شروع کر دیں۔ انہیں یقین تھا کہ اِن بچّوں کے بیج ڈالنے والے یہیں کہیں مل جائیں گے۔ کئی جگہ کنوئیں میں دراڑیں پڑی تھیں جن سے کیچڑ، گوبر، سڑا ہوا فُضلہ، مچھلی کی ہڈّیاں اور بے شمار چھوٹے چھوٹے کیڑے بجبجاتے ہوئے اُبل پڑے۔ سرغنے نے سخت جذباتی ہو کر ایسے سوالات پوچھنے شروع کر دیے جو صرف بیوقوف ہی پوچھ سکتے ہیں "بھائیو! بتاؤ تم کس کی اولاد ہو؟ تم کس مُلک سے آئے ہو؟ کون سی ریتیں روائیتیں تمھیں اس کنوئیں پر لائی ہیں؟" اور جب سرغنے کو کوئی جواب نہ ملا تو وہ ایسے ہنسنے لگا جیسے ظاہر کر رہا ہو کہ یہ سب گویا مذاق تھا۔ پھر اُنھوں نے کنوئیں کی سیڑھیاں توڑنی شروع کر دیں... بچّے اور سُور بھاگ کھڑے ہوئے۔ سرغنے نے سب کو حکم دیا کہ یا تو سُوروں کی دُمیں پکڑ لیں یا

بچّوں کی آوازوں کا پیچھا کریں۔ اُسے یقین تھا کہ بچّوں کے ماں باپ کہیں قریب ہی ہوں گے۔ سُوَر یقیناً کسی باڑے کا رُخ کریں گے اس لیے کہ اُن میں بہت سی گابھن سُوَرنیاں بھی تھیں جو حملے سے بچنے کی کوشش کریں گی۔ اور اس طرح یہاں کے باشندوں کے بارے میں کوئی سراغ مل جائے گا۔

سرغنے کا حکم سُن کر پرچھائیں کا پیچھا کرنے والوں نے اپنے چہرے پینٹ کیے، اُن پر ڈراؤنے کھوٹے چڑھائے، زرہ بکتریں پہنیں اور اپنے بدن بھُلائے ہوئے انصاف کے عمل درآمد میں جُٹ گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایسے کمینے غیر ذمّہ دار لوگ جو اپنے بچّوں کو چُلّو بھر پانی لانے کے لیے کنوؤں میں چھوڑ دیتے ہیں یا سُوَروں کو اپنے بچّوں کے بدنوں میں تھوتھنیاں چڑھانے دیتے ہیں، یقیناً دولت مند ہوں گے اس لیے سرغنے کے ساتھ ساتھ سب ایک ہی سمت میں دوڑ پڑے۔ اُن میں سے بعض نے سُوَروں کی دُمیں پکڑ لیں، بعض بچّوں کی آوازوں کا پیچھا کرنے لگے۔ کچھ دُور تک اندھا دُھند دوڑنے کے بعد اُنھیں رُکنا پڑا اس لیے کہ اُن کے آس پاس جُھگّیاں تھیں۔ سُوَر اور بچّے ایک جُھگّی میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد ایک مسرّت بھری کلکاری سنائی دی۔

باہر میدان میں ایک ڈائس بنا ہوا تھا جس پر کوئی 'مہاتما' تقریر کر رہا تھا اور نیچے کھڑے ہوئے مرد اور عورتیں خوف سے کانپ رہے تھے۔ پیچھا کرنے والوں نے کچھ اور سوچے سمجھے بنا 'مہاتما' کو جا پکڑا، اُسے ڈائس سے کھینچ کر اُتارا اور اپنے جوتوں سے اُس کے سر کا بھُرتا بنانے لگے۔ اس وقت اُنھوں نے دیکھا کہ اندر تو مہاتما کا بھیجہ ہے جس کے زنگ آلود کل پُرزے بیرونِ ملک تیّار کیے گئے تھے۔ یہ خزانہ پا کر وہ اُچھل پڑے۔ اُدھر اسٹیج کے نیچے مرد اور عورتیں اب تک کانپ رہے تھے۔

ایک بولا: "جسے اُنھوں نے مار دیا وہ تو ہمیں سُوَروں کے باڑے سے باہر

نکالنا چاہتا تھا۔"

دوسرا کہنے لگا۔" وہ ہمیں لٹیروں کا پتہ بتا رہا تھا۔"

تیسرا بولا۔" وہ جو کچھ کہہ رہا تھا میری سمجھ میں تو نہیں آتا تھا۔"

چوتھا۔" وہ بس یہ چاہتا تھا کہ ہم اُس کو چُن لیں اور راجدھانی بھیج دیں۔"

پانچواں۔" ہم نے اب تک تو کسی کا چناؤ کیا نہیں، وہ خود ہی راجدھانی پہنچ جاتے ہیں۔"

چھٹا۔" اور وہاں مُخبر بن جاتے ہیں۔"

سرغنے نے ڈپٹ کر پوچھا۔" کیا تم لوگوں کے پاس تھوڑا سا مٹّی کا تیل ہوگا؟"

ایک بوڑھا آدمی آگے بڑھا۔" کیا تم ہماری جھگیّوں کو آگ لگانا چاہتے ہو؟"

" مٹّی کا تیل ہمیں اس یبھجے کے زنگ آلود کَل پُرزے صاف کرنے کے لیے چاہیے۔"

باشندوں میں سے ایک دوڑا دوڑا گیا اور مٹّی کا تیل لے آیا۔ سرغنے اور اُس کے پیروکاروں نے زنگ آلود پُرزوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور خوب چمکا دیا۔ پھر انھوں نے اُن سے اپنی جیبیں بھر لیں۔ اپنی اس کارگزاری پر وہ بہت ہی خوش تھے اور معزز نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ وہ مشکوں کی طرح پھولنے اور سکڑنے لگے۔

سرغنے نے پوچھا۔" تم اپنے بچّوں کے فُضلے کا کیا کرتے ہو؟"

بوڑھا بولا۔" ہمارے کوئی بچّے نہیں۔"

" پھر سُوروں کے باڑے میں کون کلکاریاں مار رہا ہے؟"

" سُور جفتی کھا رہے ہوں گے۔"

" تمھیں سُوروں اور انسانوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟"

" تمھارے خیال میں کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟"

"تو کیا تمھارے بچّے سُوَرنیوں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں؟"

"یُوں سمجھتے ہو تو پھر یُوں ہی سہی۔"

"بہت مال ہوگا تمھارے پاس۔ تم سب مجھے اچھے خاصے دولت مند لگتے ہو۔"

اس پر بوڑھے کے ساتھی مَردوں اور عورتوں نے اچانک اپنی آنکھیں نوچ نکالیں اور انھیں اپنی ہتھیلیوں پر سجا لیا۔ سرغنہ اور اُس کے جتھے والے حیران رہ گئے۔ وہ ایسے منظروں کے عادی نہیں تھے۔ اُنھیں منصفوں کا سوانگ رچانے والے لٹیروں اور کُھلی ہتھیلیوں پر سے گھورتی ہوئی آنکھوں کے درمیان کوئی ربط سمجھ میں نہ آیا۔

سرغنے نے پوچھا: "کیا تم لوگ آنکھوں کے بغیر دیکھ سکتے ہو؟"

بوڑھے نے جواب دیا: "کیا تم ہماری آنکھیں راجدھانی لے جا سکتے ہو؟"

"تمھیں کیسے معلوم کہ ہم واپس راجدھانی جائیں گے؟"

"اچھّا یہ بتاؤ تم انھیں بیچ نہیں سکتے؟"

"ایسی بھیانک غلاظت کون خریدے گا؟"

"کیوں۔ کیا وہاں کوئی عجائب گھر نہیں ہے؟"

"مگر انھیں عجائب گھر میں تو نہیں رکھا جا سکتا!"

"پھر کیا ہم تمھیں اپنی پگڑیاں دے دیں؟"

"ہم صرف ٹائیاں پہنتے ہیں۔"

"ہم بہت دن برہنہ سَر رہے ہیں۔ ہم نے اپنی پگڑیاں ٹین کی پرانی پیٹیوں میں چھپا رکھی ہیں۔"

"اِسی لیے تم گنجے ہو۔ تم پگڑیاں کیوں نہیں باندھتے؟"

"نہیں باندھ سکتے۔ ہم محفوظ رہنا چاہتے ہیں۔ یہ سیدھی لمبی سیاہ شاخیں دیکھ رہے ہو؟ ہم وہ۔ وہ نہیں بننا چاہتے۔ ہم خود کو پھانسی نہیں دینا

چاہتے۔"

"کیا ہم نے ابھی بتایا نہیں کہ ہم صرف ٹاٹیاں پہنتے ہیں؟"

"ٹاٹیاں بہت چھوٹی پڑ جائیں گی، تمھارے کام کیلئے بے کار ہیں.... پگڑیاں اچھی رہیں گی۔ آسانی بھی ہو گی۔"

"اَبے آدمی بنو! ۔ ہم کیا کوئی خودکشی کرنے والوں کا ٹولا ہیں؟"

"جو بھی ہو ہم اپنے بچّوں، اپنی خوب صورت معصوم گایوں کو تمھارے حوالے نہیں کر سکتے۔"

"تمھیں پتہ ہے ہم کون ہیں؟"

"پتہ ہے ۔ تمھیں پگڑیوں کی سخت ضرورت ہے۔"

"سب سے پہلے تو تمھیں یہ سکھانا ہوگا کہ بات کس طرح کی جاتی ہے۔"

"کیا تم اِن سُورَوں کو راجدھانی لے جا سکتے ہو؟"

"ہم ایک طویل پرچھائیں کا پیچھا کر رہے ہیں اور شاید ایک روز تمھیں بھی لازماً ایسا ہی کرنا......."

"ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔"

"دھت تمھاری! ..... یہ بتاؤ تم کب تک ایسے اَن پڑھ حرام زادے بنے رہو گے؟"

"کیا تم راجدھانی یہاں نہیں لا سکتے؟"

قبل اِس کے کہ کچھ اور ہوتا، طویل پرچھائیں کو کُہرے میں داخل ہوتے دیکھا گیا اِس لیے پھر سے تعاقب شروع ہو گیا۔

ہر طرف سنّاٹا پھیل گیا تھا اور اسٹیج کوڑے کے ایک تاریک ڈھیر کی صورت میں اُبھر رہا تھا۔ جھگیوں سے کسی قسم کی آواز نہیں آ رہی تھی ۔ بچّے اور سُور سکون کی نیند سو رہے تھے۔ کھیت دُور دُور تک خالی تھے۔ بس قدموں کے دھندلے

نشانات کا ایک گنجلک جال بچھا تھا۔ میں انتظار کر رہا تھا۔ برابر میں بوڑھا خاموش کھڑا تھا۔ میں جاتے ہوئے اُسے سلام کرنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت میرے دوست نے اشارہ دیا۔ طویل پرچھائیں کا پیچھا کرنے والوں نے رُخ بدل لیا تھا اور وہ مڑ کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ہم آگے چل پڑے۔

میرا دوست بولا: "تمھیں بوڑھوں کو سلام نہیں کرنا چاہیے۔"

میں نے پوچھا: "کیوں اگر میں نے سلام کیا تو کیا وہ مجھ پر غدّاری کا ٹھپّا لگا دیں گے؟"

"ہمیں چلتے رہنا چاہیے۔"

"کیا خیال ہے۔ کیا وہ طویل پرچھائیں کو پکڑ لیں گے؟"

"مقصد یہ ہے کہ بس پیچھا کیا جائے۔"

"کیا تم نے اس پرچھائیں کو، بقول اُن کے، وادیوں، پہاڑیوں میں ریگستانی طوفانوں میں بھاگتے ہوئے دیکھا ہے؟ اُسے جھگیوں کے گرداگرد، شہر کے گندے نالوں میں، تنگ برہنہ سڑکوں پر، بجھی ہوئی بھٹّیوں کے پاس یا جہاں سُوروں کی چتائیں جلائی جاتی ہیں، وہاں، دیکھا ہے؟"

"تو گویا زبان جو خیالی نقش بناتی ہے تم اُن پر ایمان لے آتے ہو؟"

"میں کہتا ہوں وہ انسانیت کے لیے اور قوم اور پرچم کے لیے کوئی ذمّہ داری محسوس نہیں کرتے۔"

"وہ پرچم کا سلیپنگ سوٹ یا ڈبل بڈ شیٹ بنا لیں گے۔"

"میں کہتا ہوں وہ بزدل ہیں۔"

"اور اپنی بزدلی کا دفاع کرنے کے لیے وہ بندوقیں تک استعمال کرتے ہیں۔"

"ہمیں موقع ہی نہ دینا چاہیے۔"

"تب کیا وہ دوسرے 'لٹیروں' کی نشان دہی کر دیں گے۔ کیا خیال ہے

تمھارا ؟"

" نہیں! وہ اُن لوگوں کی نشاندہی کریں گے جو بے قصور ہیں۔"

"کیا پہلے کبھی اِس ملک نے لیٹروں اور خون چوسنے والوں کو جنم دیا ہے؟"

" تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہ ہمیشہ باہر سے آئے ہیں۔"

" اور برابر آتے رہیں گے۔"

" تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔"

" اور اگر کسی وجہ سے وہ نہ آسکے تو بہر صورت وہ اپنے بھیجے کے کل پُرزے یہاں بھیجتے رہیں گے۔"

" بھیجے نہیں۔ صرف غلامی درآمد کی جاتی ہے۔"

" پھر وہ ایک اسٹیج بنالیں گے جیسا اُس 'مہاتما' نے بنایا تھا اور ایک لمبی تقریر کریں گے۔"

" اور ہمیں کانپتے ہوئے عوام کے ہجوم میں شامل ہونا پڑے گا۔"

"کیا اُن میں اتنی ہمّت ہے کہ وہ ان مردوں اور عورتوں کی طرح اپنی آنکھیں نوچ نکالیں اور اُنھیں اپنی ہتھیلیوں پر سجالیں؟"

" وہ صرف کاسٹیوم اور آسن بدلتے ہیں۔"

"اِس لیے کہ اُن کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔"

" اِس لیے کہ اُن کے ہاتھ میں اقتدار نہیں ہے۔"

"کیا تم اُن کی جیبوں سے وہ زنگ آلود کل پُرزے اُڑا سکتے ہو؟"

" میں جانتا ہوں تمھیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

" میں اُنھیں سمندر میں پھینک دینا چاہتا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

"تمھیں کچھ معلوم ہی نہیں! ..... وہ ماہر غوطہ خور ہیں۔"

" میں اگر اکیلا نہ ہوتا تو بتاتا اُن کو۔"

"یہ ایک ذلیل اتّفاق ہے کہ ہم ساتھ ہیں، یا....."

"آج بھی سائنس کے کارناموں کے مقابلے میں ایسے ذلیل اتفاقات پر دنیا زیادہ بھروسا کرتی ہے۔"

"اگر میں اکیلا نہ ہوتا۔ اگر.... میں"

"تمھاری تنہائی کس کو گیس چیمبر میں پہنچائے گی؟"

"تم ہنستے کیوں ہو؟"

"چلو چلو۔ نہیں تو ہم پچھڑ جائیں گے۔"

"تمھارا دل کیسی دین داری سے دھڑکتا ہے تم نے......"

رات گہری اور سیاہ تھی اور راستے کے کھنڈروں سے بوڑھے اُلّوؤں کی آواز آرہی تھی۔ انھوں نے بہت سی چیزیں آزما کر دیکھی تھیں مگر وہ ناکام ہوئے تھے۔ آگے اندھیرے میں دریا بہہ رہا تھا۔ اُس کے چوڑے کنارے منجمد مٹیالے سنگِ مرمر کی طرح لگتے تھے۔ طویل پرچھائیں انھیں چکمہ دے کر نکل چکی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی دریا پار چلی گئی تھی۔

ہم دونوں جب وہاں پہنچے تو ہم نے دیکھا وہ دریا کنارے سر نیہوڑائے بیٹھے تھے۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ وہ مزے سے بیٹھے گپ مار رہے ہوں گے کیونکہ انھیں یہ اطمینان تو ہوگا کہ کہیں سے بھی دوبارہ تعاقب شروع کیا جا سکتا ہے اور تعاقب کو تو چلتے ہی رہنا تھا اِس لیے اب اُن کا یہ طریقہ بن گیا تھا کہ ہر وقت بس طویل پرچھائیں کے دھیان میں رہتے تھے مگر اس بار وہ واقعی دُکھی ہو گئے تھے کیوں کہ نہ تو اِس سلسلے میں وہ کوئی نمایاں دریافت کر سکے تھے اور نہ ہی اس تمام کوشش کو کوئی انقلابی موڑ دے سکے تھے، بیشتر تجربے ناکام ہوئے تھے اور سیاہ لکیریں ان کی پسلیوں میں گڑ گئی تھیں۔ اِس کے باوجود پرچھائیں کی حقیقت کا تعین اور جس سمت میں وہ فرار ہوئی تھی اُس کا فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔

"میں نے طے کر لیا ہے۔" سرغنے نے اچانک جیسے خود ہی حیران ہو کر کہا۔ "اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہم مرگ پرستی کی رسمیں ادا کریں گے۔ تاریخ کے بغیر ہم بوڑھے نہیں ہو سکتے۔ ہمیں ثابت کرنا ہوگا کہ ہمارا یہ منصوبہ کوئی جعلی کارروائی نہیں تھی۔ لیکن اس بات کو میں جس طرح سمجھتا ہوں، بتانا چاہتا ہوں، سنو! ہمیں ایک بات کا بہت خیال رکھنا پڑے گا۔ اپنی عبادت کی رسموں کے لیے ہمیں ایک ممتاز حیثیت کی لاش درکار ہوگی۔"

کسی نے کہا: "تمام لاشیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔"

"میرا مطلب تھا کسی بڑے آدمی کی لاش۔"

"مگر بڑے آدمیوں کی لاشوں کو محفوظ رکھنا ہماری روایت کا حصہ نہیں ہے۔"

سرغنہ یہ سن کر مایوسی کے ساتھ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"اچھا! کیا کسی بڑے آدمی کے نظریات کی لاش سے کام نہیں چل سکتا؟"

"ہمیں ایسی لاش ملے گی کہاں سے؟" سرغنہ جو اب تک حیران تھا بول پڑا۔

"ہم سب جگہ تلاش کریں گے۔"

اس پر اُن سب نے اتفاق رائے کیا پھر کئی راتوں تک انھوں نے بچوں اور عورتوں، بوڑھوں اور ذہین نوجوان طالب علموں میں اپنی تلاش جاری رکھی۔ اُنھوں نے لائبریریاں چھان ماریں، بینکوں کے لاکر توڑ دیے، ذاتی سامان میں ڈھونڈتے رہے۔ ناتواں اور مرتے ہوئے لوگوں کی وصیتیں اکٹھا کیں۔ اُنھوں نے پُلوں کے تختے اکھاڑ دیے۔ اور کول تار کی پختہ سڑکیں کھود ڈالیں۔ انھوں نے شرمیلی دیہاتی لڑکیوں کو لے جانے والی پردے دار بیل گاڑیوں میں جھانکا۔ وہ ان چولھوں کی راکھ کریدتے رہے جن کی آگ مدتوں پہلے بجھائی جا چکی تھی۔ اُنھوں نے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کی زبانوں کا معائنہ کیا..... اکثر و بیشتر خستہ حال مگر مسکین لوگوں کے درمیان سے وہ گزرتے اور انھیں "طویل پرچھائیں" کی دہشت

سے بدحواس چھوڑکر آگے بڑھ جاتے۔ انھوں نے بھک منگوں کو دہشت زدہ کیا اور اُن کی گدڑیوں کی سیونوں میں اپنی تلاش جاری رکھی۔

اس ایک لاش کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے زمین آسمان ایک کر دیا۔ وہ جہاں بھی گئے یہی ایک فقرہ دہراتے رہے کہ "کیا تم میں سے کوئی اُس مہان آتما والے کو جانتا ہے جو ننگے فقیر کے نام سے پہچانا جاتا تھا، وہ لاٹھی ٹیک کر چلتا تھا اور بڑی اِترا ہٹ کے ساتھ اعلان کرتا تھا کہ تمام بنی نوع انسان میرا مسئلہ ہیں"

اِترا ہٹ۔ بمشکل یہ لفظ زبان سے ادا ہوتا کہ وہ لوگوں کے گھٹے ہوئے خیالات کو کھدیڑ کر دبوچ لینے کی غرض سے اپنے کُتّے چھوڑ دیتے اور لوگ لرزتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر زمین پر جُھک جاتے۔ امّید ختم ہو چکی تھی مگر پرچھائیں کا پیچھا کرنے والوں نے اپنا تعاقب جاری رکھا۔

ایک بار پھر وہ جھگیوں کی طرف گئے۔ کوڑے کے ڈھیر پر انھوں نے ایک نیا منچ بنایا اور سُوروں کو اور تمام بچّوں، مردوں اور عورتوں کو اکٹھا کیا۔ اُنھوں نے کنویں کھُدوانے کا وعدہ کیا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ سُوروں کو راجدھانی لے جائیں گے۔ اِس کے بعد اُنھوں نے اپنی شرطیں پیش کیں مگر کچھ نہ ہوا۔ اُنھوں نے ٹین کی پُرانی زنگ آلود پیٹیاں توڑ ڈالیں اور لوگوں کی پگڑیوں کو ٹٹول کر دیکھا۔ اُنھوں نے خوب صورت معصوم گایوں کی آنکھوں میں دیکھا مگر کچھ نہ ہوا۔

کانپتے ہوئے مَردوں اور عورتوں نے انھیں بتایا کہ ہم نے ان علاقوں میں کبھی کوئی لاش نہیں دیکھی۔ لوگ مرتے ہیں لیکن فوراً ہی ان کا کریا کرم کر دیا جاتا ہے۔ اب کیونکہ کوئی امّید نہیں تھی اِس لیے وہ چل پڑے اور ایک رات ایک دریا کے کنارے جمع ہوئے تاکہ اور زیادہ گفت و شنید کی جاسکے۔ یہ بڑی سنسان

سی جگہ تھی۔ آس پاس کوئی جاسوس بھی نہیں تھا اور میں سمجھ گیا کہ اب جلد ہی ہم سچائی کی تہہ تک پہنچ جائیں گے۔ طویل پرچھائیں کا مسئلہ اٹھانے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے اپنے دوست کی طرف دیکھا وہ مجھے اس وقت یہ مسئلہ چھیڑنے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچھا اگر میں اس کی نہ سنوں تو کیا ہو گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہی حق پر ہو؟ میں تذبذب میں پڑ گیا۔ اس بھیانک یخ زدہ کورس کے سوا میرے پاس اور ثبوت بھی کیا ہے؟ اور ان کانپتے ہوئے مُردوں عورتوں کے پاس بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ .... میں نے ان کے سرغنے کو گھورتے اور ہماری طرف دانت نکوسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کہ کیا بزدلوں کی فتح بھی اتنی من موہنی ہو سکتی ہے۔

میں پھٹ پڑا۔ "تم سب جھوٹے اور غدّار ہو۔"

"ہم اِن لفظوں کو تسلیم نہیں کرتے۔" سرغنے نے کہا۔ اس کی آواز فہم کے دائرے سے باہر تھی۔

"تم قصوروار ہو۔ تم سب ...."

"ہم تاریخ بنانے والے لوگ ہیں۔"

"اور تمھاری تاریخ جھوٹ کا پلندا ہے۔ بے معنیٰ ہے۔ تم نے اگر کچھ کیا ہے تو بس یہ کہ اپنے لیے ایک سانچا ڈھونڈ لیا ہے۔"

"تاریخ محض تاریخ ہے۔ وہ نہ سچ ہے نہ جھوٹ۔"

"تم صفحۂ اَبَد پہ ایک دھبّا بنے رہو گے۔"

"ہم صرف 'رہیں گے'۔"

"تمھارا منصوبہ ناکام ہو چکا ہے۔"

"ہمیں کامیابی کی خواہش نہیں تھی۔"

"ہم دونوں تمھیں تباہ کر دیں گے۔ ہم لوگوں کو بتا دیں گے کہ تم کون ہو۔

ہم تمھارا راز کھول دیں گے۔"

"تاریخ اپنے بھگوڑوں کو نہیں پہچانتی۔ جو تمھارا جی چاہے کہو۔ لوگ تمھیں ہمارا ترجمان سمجھیں گے۔ ہماری ناکامی تمھاری سُرخروئی بن جائے گی۔ تم ہمیں اسٹیبلش کر دو گے۔"

پھر اس کے ساتھ ہی وہ سب اُٹھے اور وادی کے محفوظ حصّے کی طرف چلے گئے۔

میں چیخنے لگا "انھیں روکو! انھیں روکو! یہ سب قاتل ہیں.... یہ سب..."

"ہمیں خاموش رہنے کی عادت اختیار کرنی چاہیے۔" میرے دوست نے کہا۔

"میں انھیں جانے نہیں دوں گا۔"

"یہ بتاؤ تم آ نہیں رہے ؟"

"میں کسی فیصلے پہ پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"جب کسی فیصلے پہ پہنچو گے تو ختم ہو جاؤ گے۔"

"نہیں میں تمھیں نہیں جانے دوں گا۔ تم میرے گواہ ہو۔ میرے...."

"میں خود کو ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ میں جا رہا ہوں۔"

میں اُس سے لپٹ گیا۔ "میں تمھیں نہیں جانے دوں گا۔"

"اب اُنھیں لاش مل جائے گی۔ اب اُنھیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔" میرے دوست نے چیخ ماری اور بے جان ہو کر گر گیا۔

میں نے آنکھ کھولی تو صبح تھی۔ بھیانک فیل پا سے سُوجے ہوئے ایک پیر تلے میری گردن دبی پڑی تھی اور میلوں میل تک اس گھناؤنے مرض کا سایہ پھیلا ہوا تھا۔

بورخیس کی کہانی دستِ خُداوند کی تحریر

قید خانے کی عمارت بلند ہے اور پتھّر کی بنی ہوئی ہے۔ اس کی شکل تقریباً ایک کامل نصف کُرّے کی ہے، کیونکہ فرش نے، جو پتھّر کا ہے، نصف کرّے کو اس کے انتہائی ممکنہ قطر سے ذرا اُوپر کاٹ دیا ہے اس طرح عمارت کے پھیلاؤ اُس کے جبر کا تاثر کچھ اور گہرا ہوگیا ہے۔ ایک دیوار عمارت کو دو برابر حصّوں میں تقسیم کرتی ہوئی اُوپر تک چلی گئی ہے۔ یہ اگرچہ بہت بلند ہے لیکن عمارت کی محرابی چھت تک نہیں پہنچتی۔

دیوار کے ایک طرف میں موجود ہوں، تزیناکن ______ قہولوم کے اس ہرم کا مہنت جسے پیدرو دی الویریدو نے نذرِ آتش کر دیا تھا۔ اور دوسری جانب ایک گُلدار ہے جو اپنی اسیری کے زمان و مکان کو دزدانہ اور ہموار قدموں سے ناپتا رہتا ہے۔ فرش کی سطح پر بیچ کی دیوار کو پھاڑتی ہوئی ایک لمبی کھڑکی ہے جس میں سلاخیں لگی ہیں۔ اس ایک ساعت (نصف النہار) میں کہ جب سائے نہیں ہوتے، چھت میں ایک دروازہ کُھلتا ہے اور ایک جیلر جو گزرتے برسوں کے ساتھ گلتا، معدوم ہوتا جا رہا ہے، لوہے کی ایک چرخی کو حرکت دیتا ہے اور ہمارے لیے رسّے کے سرے پر بندھے پانی کے مرتبان اور گوشت کے ٹکڑے اُتار دیتا ہے تو گنبد میں روشنی داخل ہوتی ہے۔ اس ایک لمحے میں، مَیں گلدار کو دیکھ سکتا ہوں۔

میں جتنے برس تاریکی میں پڑا رہا اُن کا شمار بُھول چکا ہوں۔ ہر چند کہ میں کبھی جوان تھا اور اس قید خانے میں چل پھر سکتا تھا، اب میں کچھ نہیں کرتا، بس اپنی موت کی مُدرا میں انتظار کرتا ہوں، اِس خاتمے کا جو اُنھوں نے

میرے لیے تیار کر رکھا ہے۔ میں نے اپنے وقت میں چقماق کے لابنے خنجر سے قربان کیے جانے والوں کے سینے چاک کیے ہیں، مگر اب کسی افسوں کے بغیر میں خود کو خاک سے اُٹھا بھی نہیں سکتا۔

ہرم کی آتش زنی سے پہلے والی رات میں ان آدمیوں نے جو بلند قامت گھوڑوں سے اُترے تھے، ایک کنزِ مخفی کا پتہ معلوم کرنے کے لیے مجھے تپا کر سُرخ کی ہوئی دھات سے پیٹا۔ میری آنکھوں کے سامنے انھوں نے خداوند کے مجسمے کو گرادیا، مگر اُس نے مجھے بے یار و مددگار نہ چھوڑا۔ میں ان کی اذیّتوں تلے بھی خاموش رہا۔ انھوں نے مجھے چیر دیا، مجھے ضربیں لگائیں، میرے ہاتھ پاؤں توڑ دیے اور پھر اس قید خانے میں میری آنکھ کھُلی جس سے فانی زندگی میں مجھے چھٹکارا نصیب نہیں ہوگا۔

وقت گزارنے کی خاطر، کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت سے مجبور ہو کر میں نے فیصلہ کیا کہ اس اندھیرے میں وہ سب کچھ یاد کروں جو میں جانتا ہوں۔ بعض سنگی اژدروں کی ترتیب اور تعداد، یا افسوں سازی کے کسی درخت کی شکل یاد کرنے میں میں نے پوری پوری راتیں ضائع کر دیں۔ اس طرح میں نے برسوں پر فتح پائی اور وہ سب جو میری ملک تھی اس کا قبضہ حاصل کیا۔

ایک رات میں نے محسوس کیا کہ میں ایک قطعی یادداشت کے قریب پہنچ رہا ہوں۔ سمندر کو دیکھنے سے قبل مسافر اپنے لہو میں ایک ہیجان محسوس کرتا ہے۔ گھنٹوں بعد میں نے کہیں دُور اِس یاد کی موجودگی کا ادراک کرنا شروع کیا۔ یہ خداوند سے متعلق ایک روایت تھی۔ تخلیق کے پہلے دن ایک پیش آگہی سے جان کر کہ وقت کے خاتمے پر بڑی بدنصیبی اور تباہی برپا ہوگی۔ خداوند نے ایک ایسا کلمۂ سحر تحریر کر دیا تھا جو ان بلاؤں کے رَدّ کی تاثیر رکھتا تھا۔ اُس نے یہ کلمہ

اس طور لکھا تھا کہ انتہائی دُور دراز نسلوں تک پہنچے اور اتفاقِ محض سے متاثر نہ ہو سکے۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ کس جگہ اور کن حروف میں یہ کلمہ لکھا گیا ہے، لیکن یقینِ کامل ہے کہ یہ راز ہی رہے گا اور بلاشبہ کوئی چنندہ انسان ہی اسے پڑھے گا۔ میں نے غور کیا کہ ہمیشہ کی طرح ہم یُگ کے اختتام پر ہیں اور کیوں کہ خداوند کا آخری مہنت ہونا میرا مقدّر ہے، سو عین ممکن ہے کہ مجھے ہی اس لکھت کا رمز پڑھنے کی سعادت نصیب ہو۔ ہر چند کہ میں قید خانے میں پڑا تھا مگر اِس حقیقت کا احساس مجھے امید سے محروم نہ کر سکا۔ شاید میں نے قھولوم میں ہزار دفعہ یہ تحریر دیکھی ہوگی اور میں شاید اِسے سمجھنے سے قاصر رہا ہوں۔

اِس خیال نے مجھے حوصلہ دیا، مجھے عجیب طرح خیرہ و سرشار کر دیا۔ زمین کی حدود میں ایسے قدیم و کہنہ اجسام اپنے وجود رکھتے ہیں جن میں کوئی بگاڑ نہیں پیدا ہو سکتا۔ جو لافانی ہیں۔ تو ممکن ہے اِنھی میں سے کوئی جسم وہ علامت ہو جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ ایک پہاڑ ہی خُداوند کا لفظ ہو سکتی ہے، اِسی طرح ایک دریا، ایک سلطنت یا ستاروں کی ترتیب۔ لیکن صدیوں کے دَورانیے میں پہاڑیاں ہموار ہو جاتی ہیں، دریا اپنی گزرگاہیں بدل لیتے ہیں۔ سلطنتیں پامال ہوتی اور تغیّر کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ستاروں کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ آسمان میں ایک تبدّل ہے۔ پہاڑیاں ثابت و سیّار افراد ہیں، اور افراد معدومیت کی زد پر ہوتے ہیں۔ میں نے زیادہ مستحکم چیزوں کی تلاش شروع کی۔ ایسی چیزیں جو کم غیر محفوظ ہوں۔ میں نے اناجوں کی نسلوں ــــ گھاس، چڑیوں اور انسانوں کی پیڑھیوں کے بارے میں سوچا۔ شاید یہ افسوں میرے چہرے پر لکھا ہوگا۔ شاید اپنی تلاش کا مقصود میں خود ہوں۔ میں اِس گتّھی کے الجھاوے میں تھا، اچانک مجھے یاد آیا کہ خداوند کی صفات میں سے ایک صفت یہ گلدار ہے۔

اور تب میری رُوح تکریم و تقدیس سے معمور ہو گئی۔ میں نے شروعات وقت کی اس پہلی صبح کا تصوّر کیا۔ میں نے تصوّر کیا کہ میرا خداوند گلداروں کی زندہ کھال کو یہ ابدی پیغام تفویض کر رہا ہے۔ گلدار لاتعداد بار جفتی کریں گے، غاروں گپھاؤں میں، آبی گھاس کے قطعوں پر، جزیروں میں اپنے جیسوں کو جنتے رہیں گے تاآنکہ آخری آدمی تک یہ پیغام پہنچ جائے۔ میں گلداروں کے اِس تسلسل کو، پیچیدگی کے اِس سیلِ گرم کو اپنے تصوّر میں لایا۔ خیال کیا کہ یہ تسلسل جو چراگاہوں، گلوّں میں دہشت پھیلائے ہوئے ہے، یہ اِس لیے ہے کہ ایک غایتِ خداوندی کو محفوظ رکھا جا سکے۔

تو دوسرے حصّے میں ایک گلدار تھا۔ میں نے معلوم کر لیا کہ یہ موجودگی میرے قیاس کی تصدیق ہے، ایک رازدارانہ عنایت ہے۔

میں نے طویل برس اِس گلدار کی کھال پر پڑے نشانات کی ترتیب اور ہیئت کو یاد کرنے میں صَرف کیے۔ ہر اندھا دن میرے لیے روشنی کا ایک لمحہ روا رکھتا تھا تاکہ میں زرد کھال پر پڑے سیاہ دھبّوں کو اپنے ذہن پر مُرتسم کر سکوں۔ ان میں سے کچھ چتّیاں تھیں، کچھ نے ٹانگوں کے اندرونی رُخ کو چوڑائی میں کاٹتی ہوئی دھاریوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کچھ خود کو دُہراتے ہوئے چھلّوں کی صورت میں تھے۔ شاید اِن سے ایک اکیلی آواز، ایک اکیلا لفظ مراد ہو گا۔ بہت سے دھبّوں کے گرد سُرخ حاشیے تھے۔

میں اپنی مشقّت کی تھکن کو بیان نہیں کروں گا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ میں نے اِس گنبد میں چیخ کر کہا کہ اس عبارت کو پڑھنا ممکن نہیں ہے۔ ایک خداوند کے لکھے جملے کی کلّی چیستاں کے مقابلے میں مجھے اُلجھانے والی ایک محسوساتی چیستاں کا تردّد رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ ایک ذہنِ مُطلق کس

قسم کا جملہ تراشے گا؟ میں نے غور کیا کہ انسانوں تک کی زبان میں کوئی بیان ایسا نہیں ہے جو پوری کائنات کو مبتلا نہ کر لیتا ہو، لفظ "گلدار" کہنا ان گلداروں کو بیان کرنا ہے جو اُسے وجود میں لائے، ان ہرنوں اور کچھووں کو بیان کرنا ہے جو اُس نے مار کر کھا لیے، ان چراگاہوں کو جن میں وہ ہرن چرتے رہے، اس زمین کو جس نے چراگاہیں پیدا کیں اور آسمان کو بیان کرنا ہے جس نے زمین پر روشنی اُتاری۔ میں نے غور کیا کہ ایک خداوند کی زبان کا ہر لفظ حقائق کی اس سلسلہ بندی کو ظاہر کر دے گا، کسی مضمرانہ یا بالواسطہ انداز میں نہیں، بلکہ ایک صریح اور قطعی انداز میں، بتدریج نہیں بلکہ ایک دم۔

ایک وقت ایسا آیا کہ کسی ربّانی کلمے کا تصوّر ہی مجھے رکیک اور بے حرمتی والا لگا۔ میں نے سوچا ایک الٰہ کو ایک لفظ ادا کرنا ہے کہ اس ایک لفظ میں ہر بات اَدا ہو جائے گی۔ بولا ہوا کوئی بھی لفظ اس کے لیے کائنات سے کم تر یا وقت کی میزانِ کُل سے کم نہیں ہو سکتا۔ "تمام" "کُل عالم" "کائنات"، یہ غریب اور ہوس مند الفاظ تو اس ایک لفظ کی پرچھائیاں اور عکس ہیں جو لفظ کہ ایک پوری زبان کے برابر اور اس "کل" کے مساوی ہے جو کوئی زبان اپنے اندر لیے ہوئے ہو سکتی ہے۔

ایک دن یا ایک رات۔ میرے دنوں اور میری راتوں میں فرق بھی کیا ہو سکتا ہے؟ میں نے خواب دیکھا کہ قید خانے کے فرش پر ریت کا ایک ذرّہ ہے میں بے اعتنائی سے پھر سو گیا، اور خواب دیکھا کہ میں جاگ اُٹھا ہوں اور فرش پر ریت کے دو ذرّے ہیں۔ میں دوبارہ سو گیا اور میں نے دوبارہ خواب دیکھا کہ ریت کے ذرّے تین ہیں۔ وہ اسی طرح بڑھتے گئے یہاں تک کہ قید خانہ ان سے بھر گیا، اور میں ریت کے اس نصف کُرے میں دم توڑنے لگا۔ میں نے

محسوس کیا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں، سو بڑی کاوش سے میں نے خود کو بیدار کیا۔ بیداری بے فائدہ تھی، ریت کے بے شمار ذرّے میرا دم گھونٹ رہے تھے۔ کسی نے مجھ سے کہا: "تم جاگ کر کسی حالتِ بیداری میں نہیں اُٹھے، یہ تو ایک پچھلا خواب ہے۔ یہ خواب ایک اور خواب میں چل رہا ہے اور اس طرح ایک لاتناہیت جاری ہے، جو ریت کے ذرّوں کی تعداد ہے۔ جس مسافت کو تمھیں پھر سے کاٹنا ہے وہ قطع نہیں ہونے کی، اور اس سے قبل کہ تم حقیقت میں بیدار ہو سکو تم ہلاک ہو جاؤ گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ میں مٹ رہا ہوں۔ ریت میرے دہانے کو کچلے دے رہی تھی مگر میں چیخ اٹھا کہ "خواب کی ریت مجھے ہلاک نہیں کر سکتی اور خواب اندر خواب کا کوئی وجود نہیں۔" ایک درخشندگی نے مجھے بیدار کر دیا۔ بالائی تاریکی میں روشنی کا ایک دائرہ نمودار ہوا۔ مجھے جیلر کا چہرہ، ہاتھ، چرخی، رسّا گوشت کے ٹکڑے اور مرتبان نظر آئے۔

مقدّر جو شکل اختیار کر لے، آدمی بتدریج خود کو اس سے شناخت کرنے لگتا ہے کہ بالآخر آدمی خود ہی اپنے فعل کا ماحول ہے۔ چیستانوں کو بوجھنے والے یا ایک منتقم، یا خداوند کے ایک مہنت سے زیادہ میں تو ایک قیدی تھا۔ ان بھول بھلیوں سے میں پھر اپنے سنگین قیدخانے میں لوٹ آیا۔ جیسے کوئی اپنے گھر لوٹتا ہے۔ میں نے اس کی سیلن کو دُعا دی، گلدار کو دُعا دی، میں نے اس روزن کو دُعا دی جو روشنی کو راہ دیتا تھا۔ میں نے اس بوڑھے دُکھتے ہوئے بدن کو دُعا دی، میں نے تاریکی اور پتھر کو دُعا دی۔

تب ایسا منظر پیش آیا جسے نہ میں کبھی بھول سکتا ہوں نہ بیان کر سکتا ہوں۔ کہ الوہیت سے، موجودات سے اِتصال کا ظہور ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا یہ

دو لفظ ہم معنی ہیں) انبساط اپنی علامتوں کو نہیں دُہراتا۔ بعضوں نے خداوند کو درخشندگی میں دیکھا ہے، بعضوں نے تلوار میں اور بعضوں نے گلاب کی پنکھڑیوں کے دائرے دل میں۔

میں نے ایک انتہائی بلند پہیہ دیکھا جو نہ میری آنکھوں کے سامنے تھا، نہ پیچھے، نہ دائیں نہ بائیں۔ وہ بہ یک وقت ہر جانب تھا۔ یہ پہیہ پانی سے بنا تھا اور آگ سے بھی، اور (اگرچہ اس کے سرے نظر آرہے تھے) وہ لامتناہی تھا۔ وہ منجملہ ماضی، حال و مستقبل سے مرتّب تھا۔ اس پوری بُنَت کا ایک دھاگا میں تھا اور دوسرا دھاگا پیدرو دی الویریدو، کہ جس نے مجھے اذیتیں دی تھیں۔ اب اسباب و عِلَل منکشف تھے اور معلول منکشف تھے کہ ہر شے کو لامحدودیت کے ساتھ سمجھنے کے لیے میرا ایک بار اس پہیے کی طرف دیکھنا ہی کافی تھا۔

تصوّر کرنے یا محسوس کرنے کی مسرّت کے مقابلے میں علم و آگہی کی مسرّت کس درجہ بڑی ہوتی ہے۔ میں نے کل ممکنات کو دیکھا۔ میں نے کائنات کے مخفی نقش دیکھے۔ میں نے مبداء و مآخذ دیکھے کہ کتابِ صَلاح میں جن کا بیان ہے۔ میں نے پہاڑیاں دیکھیں جو پانیوں پہ سے اُٹھی تھیں۔ میں نے دشت کے پہلے انسانوں کو دیکھا۔ میں نے پانی کے ظروف دیکھے جو اُن آدمیوں سے منحرف ہو گئے تھے۔ میں نے وہ کتّے دیکھے جنھوں نے اُن کے چہرے چیر پھاڑ دیے تھے۔ میں نے وہ بے چہرہ اِلٰہ دیکھے جو ایک تنہا مسرت کی تشکیل کرتے ہیں اور ہر شے کی آگہی حاصل کرتے ہوئے مجھے گلدار کی کھال کی لکھت کا علم بھی حاصل ہو گیا۔

یہ چودہ بے ضابطہ الفاظ سے ترتیب دیا ہوا ایک افسوں ہے (یا شاید وہ ایسے لفظ ہیں جو فی الاصل بے ضابطہ نہیں ہیں بلکہ ایسے نظر آتے ہیں) مجھے قدرت و اختیار حاصل کرنے کے لیے محض بلند آواز سے انھیں ادا کرنا ہوگا۔

مجھے اس سنگین قید خانے کو معدوم کرنے کے لیے، اپنی شبِ تاریک میں دن کے نفوذ کے لیے، مردِ جواں بن جانے کے لیے، لافانی بننے کے لیے، اور اِس بات کے لیے کہ شیرالویریدو کو فنا کر دے، ہسپانویوں کے سینوں میں مقدّس خنجر اُتارنے کے لیے، ہرم کی دوبارہ تعمیر کے لیے، سلطنت کو پھر سے تشکیل دینے کے لیے اِن الفاظ کو ادا کرنا ہوگا. چالیس ارکانِ تہجّی۔ چودہ لفظ۔ اور پھر میں، تزیناکن اِس قلم رَو پر حکمرانی کروں گا جو مونتے زوما کے زیرِ نگیں تھی. لیکن میں جانتا ہوں کہ میں وہ الفاظ کبھی ادا نہیں کروں گا، اِس لیے کہ اب مجھے کوئی تزیناکن یاد نہیں۔

تو اَب گلدار کی کھال پہ لکھا ہوا رمز میرے ساتھ ہی فنا ہو جائے۔ وہ جس نے موجودات کی جھلک دیکھ لی ہو، جسے ممکنات کی شعلہ زن نگارشوں کا ایک جلوہ نظر آگیا ہو، وہ ایک آدمی کے بارے میں، اور اُس کی ادنیٰ مسرّتوں، اس کی بدنصیبیوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، خواہ یہ آدمی وہ خود ہی کیوں نہ ہو۔ بے شک کبھی وہ یہ آدمی تھا، لیکن اب اُسے کوئی پروا نہیں۔ اب جب کہ وہ کوئی بھی نہیں ہے، وہ اُس دوسرے کے مقدّر کے بارے میں کیوں فکرمند ہو، وہ اُس دوسرے کے قبیلے کے بارے میں کیوں سوچے۔

اِس لیے مَیں وہ افسوں نہیں پڑھتا۔ اِس لیے مَیں اندھیرے میں پڑا ہوا دِنوں کو اجازت دیتا ہوں کہ مجھے فراموش کر دیں، فنا کر دیں۔